فلسفۂ توحید



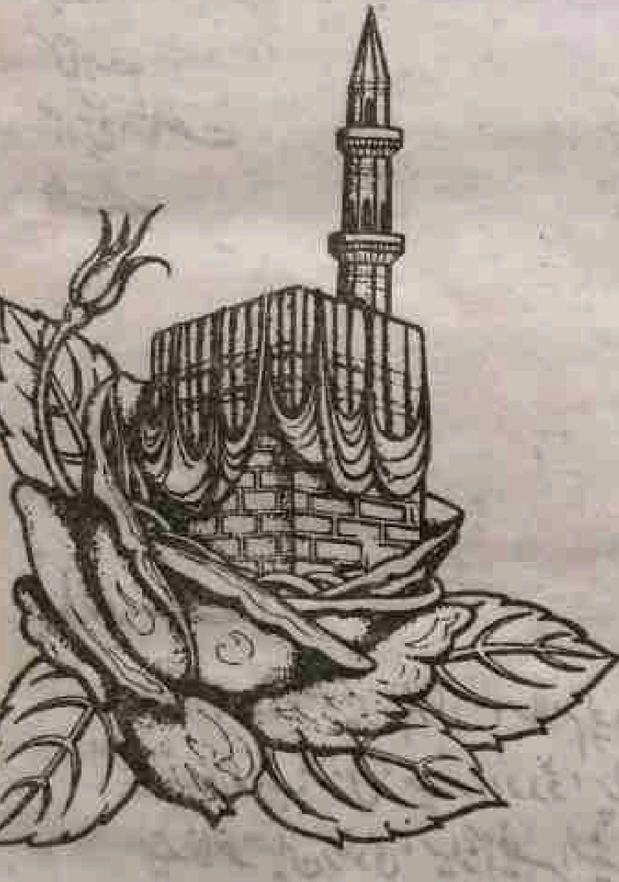
تالیف؛ جناب مولانا طالب حسین کرپالوی

فلسفہ توحید

لا اِلٰہ

ج۱

جلد ۱



تالیف: جناب مولانا طالب حسین کرپالوی

ناشر: جعفریہ دار التبلیغ ○ سانده کلاں ○ لاہور

اسم کتاب : فلسفۂ توحید
مؤلف : طالب حسین کرپالوی
ناشر : جعفریہ دار التبلیغ لاہور
مطبع : معراج دین پرنٹرز، لاہور
بار : اوّل
کتابت : عزیز احمد قریشی
تاریخِ اشاعت : یکم اپریل ۱۹۹۰ء
ھدیہ : ساٹھ روپے

نمائندے:

افتخار بک ڈپو، مین بازار، اسلام پورہ، لاہور
حیدری کتاب منزل، حیدری روڈ، پرانا سکھر
سیّد فاخر حسین رضوی، سیلز آفیسر اسٹیٹ لائف انشورنس، نوید سنٹر، کچہری بازار، سیالکوٹ
سیّد باقر امام زیدی مکان ۲۱۶، سٹریٹ ۱۴، افشاں کالونی، قاسم روڈ، راولپنڈی کینٹ
سیّد سجاد امام زیدی مکان ۹۸۱/۲۰، فیڈرل بی ایریا، کراچی
سیّد عابد زیدی مکان ۳۸۳ - بی II، محلہ لیاقت آباد، نواب شاہ
پروفیسر غلام عباس سریوال، بی - ۱۳۳، آفندی ٹاؤن، حیدرآباد
سیّد عون محمد زیدی - مکان ۱۰۷۸، حمام سٹریٹ، لطیف جان بلڈنگ، پشاور صدر
مولانا محمد سلیمان، ایل - ۱۲، محلہ میانہ محمد اکبر، میانوالی
سیّد عاشق حسین، نجف اسٹور، محلہ عید گاہ، گلگت ایجنسی

آغازِ سخن

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○
الحمد للہ الذی لایبلغ مدحتہ القائلون ۔ ولا یحصی نعمائہ
العادون ۔ ولا یؤدی حقہ المجتہدون الذی لایدرکہ بعد الھمم
ولا ینالہ غوص الفطن الذی لیس لصفتہ حدٌ محدود ولا نعت موجود
ولا وقت معدود ولا اجل ممدود فطر الخلائق بقدرتہ ونشر الریاح
برحمتہ ۔ ووتد بالصخور میدان ارضہ

اول لدین معرفتہ وکمال معرفتہ التصدیق بہ ۔ وکمال التصدیق بہ
توحیدہ ۔ وکمال توحیدہ الاخلاص لہ ۔
وکمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ لشہادۃ کل صفۃ انہا غیر الموصوف
وشہادۃ کل موصوف انہ غیر الصفہ ۔ فمن وصف اللہ سبحانہ فقد
قرنہ ۔ ومن قرنہ فقد ثناہ ومن ثناہ فقد جزاہ ومن جزاہ فقد جہلہ ۔
ومن جہلہ فقد اشار الیہ ۔ ومن اشار الیہ فقد حدہ ۔ ومن حدہ
فقد عدہ[1] ۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد المصطفیٰ، الصادق الامین خاتم النبیین و
سید المرسلین، وصفوۃ رب العالمین، من الخلق اجمعین، وسلام علیہ و
علی اولی العزم من الرسل والانبیاء والصدیقین، والشہداء والصالحین ۔
وعلی علی امیر المومنین، وسید المسلمین، وقائد الغر المحجلین، والی الغر
المیامین، المصابیح المشرقۃ، والاغصان المورقۃ
وعلیٰ سیدۃ النساء، فاطمۃ الزہراء البتول حبل اللہ الموصول ونورہ
المجبول وسلالۃ الرسول
وعلی السیدین الامامین السبطین سیدی شباب اہل الجنۃ، الحسن و

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱

والحسین۔

وعلی الائمة المهتدین، مصابیح الدجی، واعلام الهدی واسماء الله الحسنی، وامثاله العلیا، ارکان توحیده، ومشاکی نوره وخزان علمه وامنائه علی خلقه، الذین خلقهم من نوره وغشاهم بضیاء قدسه وزیّنهم ببهائه الّذین قضوا بالحق وبه یعدلون۔

امّا بعد!

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ مذاہب انسانی تاریخ میں اہم حیثیت رکھتے ہیں اور تمام مذاہب پر اگر طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو ان سب میں مرکزی عقیدہ اور مرکزی محور "اللہ کا تصور" خدا تعالیٰ کی ذات کا تصور ہے۔ یہ عقیدہ مذاہب کی اصل واساس ہے۔ جس طرح درخت کے قائم و دائم رہنے کا دار و مدار اس کی جڑ پر ہوتا ہے۔ نہ کہ شاخوں، ٹہنیوں، پتوں پر۔ پودے درخت کی سرسبزی، برگ وبہار کا دار و مدار اس کی جڑ کے قائم رہنے پر ہوتا ہے۔ اگر جڑ کاٹ دی جائے تو درخت اپنی طاقت پر قائم نہیں رہتا۔ مرجاتا ہے۔ ٹہنی یا کوئی شاخ کاٹنے سے درخت مرتا نہیں اور اسی طرح انسانی جسم میں دل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور انسانی زندگی کی بقا کے لئے اس کا ٹھیک رہنا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ کا تصور مذاہب میں حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ کا تصور خدا کی ذات کا تصوّر مذاہب کی روح اور جان ہے۔

خدا کی ہستی کا اقرار اور اس کی واحدانیت کا اعتقاد تمام الہامی مذاہب کا سنگ بنیاد ہے۔ مذہب کے تفصیلی عقائد اور اس کی عملی صورتوں میں آج اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے درمیان جاہے کتنے اختلافات ہوں لیکن جہاں تک ہستی باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس پر یقین اور اس کی ذاتِ واحد کو کائنات کا خالق ومالک اور مدبر وفرمانروا تسلیم کرنے میں یہ تینوں متفق ہیں۔ اس لئے مادہ پرستوں اور منکرین خدا کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اثبات ہمارے لئے مشترکہ دلچسپی کا باعث ہے۔ اور اس خدمت کو خواہ کوئی مسلمان انجام دے یا عیسائی یا یہودی وہ ہم سب کی قدر کا مستحق ہے۔ ان باتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے بندہ حقیر پُر تقصیر نے اس سلسلے کو جاری کیا اُمید ہے کہ اس سلسلے کی دس جلدیں ہوں گی انشاء اللہ۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے۔

اس کتاب کا موضوع فلسفۂ توحید ہے۔ اس کی تشریح اور توضیح اور مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کیلئے معقولات و منقولات سے استدلال کیا گیا ہے۔ اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ موضوع زیرِ بحث پر معقولات و منقولات کی روشنی میں ایک جامع اور مکمل بحث سامنے آجائے اور کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل نہ رہنے پائے۔

کتاب کی تالیف کا اصل مقصد اہلِ بصیرت اور غور و فکر کرنے والے افراد کی توجہ کا رخ توحید کی اقدار کی

طرف پھیرنا ہے۔ یہ جدل و مناظرہ کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی کسی خاندانی پوتھی یا قصے کہانیوں کی کتاب کے مطالعہ کی بنیاد پر اس کا مواد جمع کیا گیا ہے۔ بلکہ آپ کی ذہنی قوتوں اور فکری صلاحیتوں کو اجاگر کر دینے والی ایک دستاویز ہے۔ لہٰذا اسے کتاب الحرب تصور کرنا یا حرب العقائد کا اکھاڑہ بنانا نہ صرف موضوع کی روح بلکہ اپنی قوت غور و فکر اور نقد و نظر پر بھی ظلم کے مترادف ہوگا۔

حوالہ جات کا نیا طریق کار

براھین الطالب فی مناقب علی بن ابی طالب میں حوالہ جات کے طریق کار کو عام و خاص نے ناپسند فرمایا بعض نے فرمایا حوالہ جات زیادہ ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ایک جیسی عبارتوں سے قاری بور ہو جاتا ہے چنانچہ اعتراضات کی اس بوچھاڑ کے پیش نظر بندہ نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ طریق کار یورپ میں تو کافی دیر سے مروج ہے البتہ ہمارے ہاں اتنا متعارف نہیں ہے۔

نئے طریق کار کے تحت کتب مصادر کی ایک فہرست آخر میں درج کر دی گئی ہے اور ہر ایک کتاب کو ایک نمبر دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ کتاب کے اندر عبارت کے آخر میں نمبر تحریر کر دیا گیا ہے۔ اور آپ اس نمبر سے اندازہ فرما سکتے ہیں کہ یہ عبارت کس کتاب کی ہے۔ اس طریق کار سے اولاً تو عبارات کے تکرار والی بوریت خاصی کم ہو جائے گی ثانیاً حوالہ جات کی بھرمار بھی نہیں ہوگی۔

اعتراف حقیقت

بندۂ حقیر پُر تقصیر نے کتاب ھٰذا میں اہل علم کی طویل عبارتیں حوالہ جات سمیت من و عن نقل کر دی ہیں۔ اصل مقصد بھٹکے ہوئے نیم خواندہ لوگوں کو صحیح راستہ پر لانا ہے۔ اپنی علمی دھاک بٹھانا نہیں۔ وجہ معلوم ہے کہ نہ میں علامہ ہوں نہ فہامہ بلکہ ایک طفل مکتب ہوں۔ ہاں وہ ہستی جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ اس کا قرب اور اس کی رضا اصل مطلوب ہے۔ اس کی نظر کرم ہی ساحل امید ہے۔ وہ جان تمنا ہے۔ اس کی محبت حاصل زندگانی ہے۔ وہ رحمان و رحیم ہے۔ وہ رحمت و محبت کا مصدر و منبع ہے۔ وہ عفو و کرم اور محبت کا سراپا ہے۔ اس نے کسی حال میں بھی اپنے آپ سے مایوس نہیں ہونے دیا۔ پس اس کی نظر چاہیئے۔

معذرت

اہل علم کے سامنے معذرت ہے کہ اس سلسلے میں انہیں کہیں کہیں بعض دلائل و عبارات کا تکرار محسوس

ہوگا۔ یہ میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ سلسلہ در اصل میں نے ان نوجوانوں کیلئے جاری کیا ہے جو علوم جدیدہ کے چند گھونٹ پیتے ہی بہک اٹھتے ہیں۔ دین سے ناواقف ہیں۔ تیراکی نہیں جانتے لیکن مشکل علوم کے سمندر میں جا گھستے ہیں۔ ذرا سا گہرا پانی آتا ہے تو ڈبکیاں لینے لگتے ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں ان ڈوبتے ہوؤں کو سہارا دینے کی کوشش کی گئی ہے وہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں وجود خدا اور توحید پر دلائل براہین کے ذریعے انہیں تیراکی کا فن سکھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ اپنے ساتھیوں کو بھی ڈوبنے سے بچا سکیں۔ اس کام کے لئے کئی مرتبہ بعض اہم اور مختصر دلائل کو مختلف اسالیب سے بار بار پیش کیا گیا ہے۔

دُعا

ان معروضات کے بعد خالق ارض و سما اور مالک کائنات کی بارگاہ صمدیت میں اس کوشش ناتمام اور بے مایہ (متاع عزیز) کو عاجزانہ و غلامانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ اسے شرف قبولیت بخش اور فلسفۂ توحید کی وضاحت کا مؤثر ذریعہ بنا۔

میں دعاگو ہوں کہ یہ چمنستانِ علم سدا برگ و بہار میں پھولے، اس کا یہ فیض سدا جاری رہے یہ علم و نور کے چشموں کی طرح پھوٹے اور اس کے جلائے ہوئے چراغ سب کو اپنے نور سے منور کریں۔ اس میں لگائے ہوئے پھول اپنی خوشبو سے تمام لوگوں کو معطر کریں

طالب حسین کرپالوی
۱-۱۱-۸۹

باب اوّل

ایمان باللہ

ایمان باللہ، بنیادی چیز ہے

جو شخص بھی دنیا کے مختلف الہامی مذاہب اور بالخصوص اسلام کا مطالعہ کرے گا اسے اس بات کا اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ ان مذاہب نے اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو دی ہے وہ اللہ پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص کفر کی حالت کو چھوڑ کر مسلمان ہونا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے کلمہ شہادت ادا کرنا پڑتا ہے، اور اسی کلمے کی بنا پر وہ شخص ملت کفر سے کٹ کر ملت اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ شخص اللہ پر ایمان کے تقاضے پورے کرے گا تو آخرت کے اعتبار سے اجر و ثواب کا مستحق اور بصورت دیگر عذاب کا مستوجب ہوگا۔ اسلام کے نزدیک محض اس اقرار یا ایمان سے انسان کی دنیوی اور آخری زندگی یکسر بدل جاتی ہے۔(۱)

ایمان باللہ، مذہبی بنیاد ہے

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہب کی بنیاد خدا کے ایمان پر ہے، مختلف مذاہب

ہیں خدا کا نام بدل جائے گا لیکن اس کی ہستی کا اقرار اس کے ایمان ہر جگہ شرط اولین ہوگا اس سے لازماً یہ سوالات سامنے آتے ہیں کہ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ اس کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ سوالات جیسا کہ ظاہر ہے بڑے اہم، بڑے مشکل اور بڑے نازک ہیں۔ اور جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ان کے جوابات کے لئے مصروفِ تحقیق و کاوش ہے۔

قرآن نے بھی دین کی عمارت ایمان باللہ کی بنیادوں پر استوار کی ہے۔ اس لئے قرآن کے طالب علم کے سامنے بھی وہ سوالات آتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ چونکہ ان سوالات کی اہمیت قرآن کے سامنے تھی اسی لئے اس نے ان کا جواب بڑی شرح و بسط سے دیا ہے۔ (ش ۲)

اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی جتنے اعتقادات و ایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کے تکمیلی فروع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے۔ اس کا مصدر اور مرجع خدا کی ذات ہے۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں۔ کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ خدا کی نازل کی ہوئی ہیں۔ رسولوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں[۱]۔ یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔ فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ خدا نے ان کو مقرر کیا ہے۔ حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ خدا کے حکم پر مبنی ہیں۔ اوامر کی فرمانبرداری اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ہیں۔ غرض، ہر چیز جو اسلام میں ہے۔ خواہ عقیدہ ہو یا عمل، اس کی بنا صرف ایمان باللہ پر قائم ہے۔ اس ایک چیز کو الگ کر دیجئے۔ پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخر، نہ رسول اتباع کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ نہ ان کی لائی ہوئی کتابیں، نہ فرائض و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق فرائض میں، نہ اوامر و نواہی کسی قوت و نفاذ کے حامل رہتے ہیں اور نہ ضوابط و قوانین۔ اس ایک مرکز کے ہٹتے ہی یہ سارا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا (ع ۱)

خدارسی کی شرط۔ ایمان باللہ

خدارسی کے لئے اول ایمان بخدا شرط ہے اور ایمان میں کمالِ رسوخ۔ استحکام۔ استقامت جس کا

---

[۱] موصوف نے ایمان بامامت کا ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ بھی بہت ضروری ہے۔ اتنا کہ حضور اکرمؐ کے محترم صحابہ کرامؓ نے انتخاب خلیفہ کو تکفین و تدفین رسولؐ پر مقدم سمجھا۔

خدا کی نسبت ایمان و اذعان و ایقان کامل اور اعتقاد راسخ نہیں ہے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں وہ کبھی خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا اور کبھی اسکو حقیقی نجات نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ امر جس پر یقین کرنا اور ایمان لانا ضروری ہے۔ خواہ توحید ہو یا لوازم توحید اس میں جزم و رسوخ اور استحکام اور استقامت شرط ہے۔ لہذا خدا کو جاننا اور اسپر کامل اعتقاد رکھنا اول شرط نجات ہے۔ شک و شبہ کی ایمان میں گنجائش نہیں۔ اسی پر عقل سلیم شہادت دیتی ہے۔ اور اسی کی کلام خدا سے تائید ہوتی ہے حیث قَالَ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ (حجرات ۲) سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ مومن وہی لوگ ہیں جو اللہ پر اور اس کے فرستادہ رسول پر ایمان لائے اور پھر کبھی انہوں نے اس میں شک نہ کیا اور جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کیا پس ایسے ہی لوگ سچے مومن ہیں۔ جن لوگوں کو توحید یا لوازم توحید جیسے کہ نبوت و رسالت میں شک ہو جائے وہ ہرگز مومن کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ اور اسی کے سب اہل مذاہب مدعی ہیں اور سب اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن اہل عقل جانتے ہیں کہ صرف خدا کو اس قدر جان لینا کہ وہ ہے۔ نجات کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بلاشبہ عالم وجود میں بہت سی چیزیں ہیں۔ خواہ ناقص ہوں یا کامل اور نہ صرف یہ کافی ہو سکتا ہے کہ خدا ایک ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ہیں جو ایک ہیں۔ بلکہ ہر ایک فرد انسانی اپنی خصوصیاتِ شخصیہ کے ساتھ ایک ہی ہے۔ اس کا دوسرا مثل نہیں ہے۔ بلکہ ہر موجود موجودات میں سے اپنے شخصیتِ وجود کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ کوئی بھی دو چیزیں تمام لوازم و عوارض میں بالکل یکساں نہیں ہو سکتی ہیں۔ نیز دو دو نہ ہونگی باوجود ایک ہونے کے بھی دوئی سے خالی نہیں ہے اِلّا ذاتِ خالق۔ ہماری سرسری نظر میں ہمارا سورج ایک ہے۔ ہمارا چاند ایک ہے ہماری زمین ایک ہے۔ ہمارا آسمان ایک ہے۔ خدا کو صرف اس طرح ایک جان لینا کافی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اہل مذاہب صرف اسی قدر اعتقاد و ایمان پر اکتفا کرتے ہیں۔ (ع ۲۲)

ایمان باللہ کی مجمل صورت

ایمان باللہ کی مجمل صورت، جس کے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کو دخول اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے، کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے، یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف

کہ "الٰہ" بجز اُس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ "الوہیت" کو عالم وجود کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لئے ثابت کیا جائے اوران تمام جذبات، تخیلات، اعتقادات اور عبادات وطاعات کو جو "الوہیت" کے لئے مخصوص ہیں، اسی ایک ذات سے متعلق کر دیا جائے۔ اس مجمل کلمے کے اجزائے ترکیبی تین ہیں:۔

ایک ــــ الوہیت کا تصور

دوسرے ــــ تمام اشیا سے اس کی نفی

تیسرے ــــ صرف اللہ کے لئے اس کا اثبات۔

قرآن مجید میں خدا کی ذات وصفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔ اولاً، اس نے 'الوہیت' کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور پیش کیا ہے جو دنیا کی کسی کتاب اور کسی مذہب میں ہم کو نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں اور ملتوں میں یہ تصور کسی نہ کسی طور پر موجود ہے، لیکن ہر جگہ غلط یا نامکمل ہے۔ کہیں 'الوہیت' نام ہے محض اوّلیت اور واجبیت کا، کہیں اس سے مبدئیت مراد لی گئی ہے، کہیں اس کو قوت اور طاقت کا ہم معنی سمجھا گیا ہے، کہیں وہ محض خوف اور ہیبت کی چیز ہے کہیں وہ صرف محبت کا مرجع ہے، کہیں اس کا مفہوم محض رفع حاجات اور اجابتِ دعوات ہے، پھر کہیں وہ قابل تجزیہ وتقسیم ہے، کہیں اس کو تجسیم اور تشبیہ اور تناسل سے آلودہ کیا گیا ہے۔ کہیں وہ آسمانوں پر متمکن ہے اور کہیں وہ انسانی بھیس بدل کر زمین پر اُتر آئی ہے۔ ان تمام غلط یا ناقص تصورات کی تصحیح اور تکمیل جس کتاب نے کی ہے وہ صرف قرآن ہے اسی کتاب نے الوہیت کی تقدیس وتمجید کی ہے۔ اسی نے بتایا ہے کہ الٰہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو بے نیاز، صمد اور قیوم ہو، جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو۔ جس کا علم سب پر محیط، جس کی رحمت سب پر وسیع، جس کی طاقت سب پر غالب ہو، جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو، جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو، جو زندگی بخشنے اور وسائل حیات مہیا کرنے والا ہو، جو نفع وضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو، اس کی بخشش اور نگہبانی کے سب محتاج ہوں، اسی کی طرف تمام مخلوقات کی بازگشت ہو، وہی سب کا حساب لینے والا ہو اور اسی کو جزا اور سزا کا اختیار ہو۔ پھر یہ الوہیت کی صفات نہ تجزیہ وتقسیم کے قابل ہیں، کہ ایک وقت میں بہت سے 'الٰہ' ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصہ سے متصف ہوں، نہ یہ وقتی اور زمانی ہیں کہ ایک 'الٰہ' کبھی تو ان سے متصف ہو اور کبھی نہ ہو، نہ یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک 'الٰہ' میں پائی جائیں اور کل دوسرے میں۔

الوہیت کا یہ کامل اور صحیح تصور پیش کرنے کے بعد قرآن اپنے انتہائی زور بیان کے ساتھ ثابت کرتا ہے

کہ کائنات کی جتنی اشیاء اور جتنی قوتیں ہیں ان میں سے کسی پر بھی یہ مفہوم راست نہیں آتا۔ تمام موجودات عالم محتاج ہیں، مسخر ہیں، مخلوق ہیں، نافع و ضار ہونا تو درکنار خود اپنی ذات سے ضرر کو دفع کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ ان کے افعال اور ان کی تاثیرات کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں نہیں ہے بلکہ وہ سب کی سب کہیں اور سے قوت وجود، قوت فعل اور قوت تاثیر حاصل کرتی ہیں۔ لہٰذا کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جو "الوہیت" کا شائبہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو اور جس کو ہماری نیاز مندیوں میں سے کسی ایک حصہ کا بھی حق پہنچتا ہو۔[۱]

اس نفی کے بعد وہ ایک ذات کے لئے "الوہیت" ثابت کرتا ہے جس کا نام "اللہ" ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسی پر ایمان لاؤ، اسی کے آگے جھکو، اسی کی تعظیم کرو، اسی سے محبت کرو اسی سے خوف کرو، اسی سے امید رکھو، جو کچھ مانگو اسی سے مانگو، ہر حال میں اسی پر توکل کرو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ ایک دن اس کے پاس جانا ہے، اس کو حساب دینا ہے، اور تمہارا اچھا یا برا انجام اسی کے فیصلہ پر منحصر ہے (ص۱۰)

ایمان باللہ کی قرآنی دعوت

قرآن کا تمام دنیا کے انسانوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اُس خدا پر ایمان لائیں جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے۔ دنیا میں چند دہریوں کو چھوڑ کر ہر شخص ہر قبیلہ، ہر قوم کسی نہ کسی رنگ میں خدا کی قائل ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ تمہارا اس طرح خدا کو ماننا درحقیقت خدا کو ماننا نہیں۔ یہ اس خدا کا ماننا ہے جس کا تصور تمہارے یا تمہارے جیسے دوسرے انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ جیسے (مثلاً) ایک شخص کہتا ہے کہ میں مانتا ہوں کہ سونا ایک اچھی دھات ہے۔ اس کا رنگ سفید ہوتا ہے مرطوب ہوا میں اس پہ زنگ لگ جاتا ہے۔ سخت چیز سے ٹکرانے سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے چونکہ دنیا میں سب سے ہلکی دھات ہے اس لئے عام طور پہ ہوائی جہازوں کی ساخت میں کام آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے "سونے" کا ماننا درحقیقت سونے کے وجود سے انکار کرنا ہے اس لئے اس خدا کا ماننا جس کی صفات حقیقی خدا کی نہ ہوں، خدا کا اقرار نہیں، اس کا انکار ہے۔

قرآنی ایمان کی خصوصیات

---

[۱] اگر اللہ کے معصوم نمائندوں کو اللہ کا وسیلہ تسلیم کیا جائے اور ان سے معرفت الوہیت حاصل کی جائے تو انسان کیلئے زیادہ بہتر ہوگا

نہ صرف یہ کہ خدا کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا، بلکہ خدا اور انسان کا جو تعلق قرآن بتاتا ہے۔ اس کا تصور بھی کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں قرآن ہمیں بتاتا ہے۔

(۱) تمام کائنات پر خدا کا اقتدار و اختیار ہے لیکن وہ اپنے اقتدار اور اختیار کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق استعمال کرتا ہے اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بالفاظِ دیگر یہ تمام سلسلۂ کائنات لگے بندھے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے جو محکم اور اٹل ہیں۔ یہی قوانین خود انسانوں کی دُنیا میں بھی کارفرما ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل ایک متعین نتیجہ پیدا کرتا ہے اور اس میں کبھی استثناء نہیں ہوتی۔ ہر انسان کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جو عمل چاہے کرے۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ عمل تو ایک قسم کا کرے اور نتیجہ دوسری قسم کا پیدا کرے۔ جس قسم کا عمل ہوگا اسی قسم کا نتیجہ مرتب ہوگا۔ یہ نتائج خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

(۲) بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتہً خدا کی لا متناہیت اور لا محدودیت سے ہے (مثلاً یہ کہ اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ نہ ہی وہ عدم سے وجود میں آیا ہے) انسانی ذات کی بنیادی صفات وہی ہیں جو صفات ذاتِ خداوندی کی ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ انسانی ذات کی یہ صفات، محدود اور سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔ نیز قابلِ نشوونما (ان کی نشوونما اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ انسان صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھے۔ یہ انسان اور خدا کا بنیادی تعلق ہے۔ جس چیز کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کہتے ہیں وہ (معاذ اللہ) کسی مستبد، مطلق العنان ڈکٹیٹر کے احکام کی فرماں پذیری نہیں ہوتی بلکہ ان ہدایات () کی اتباع ہوتا ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

ان ہدایات کی اتباع سے اس ذات کے تقاضوں کی تسکین ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ہم خدا کی صفات (اسماء الحسنیٰ) کا ذکر کرتے ہیں تو وہ سمٹی ہوئی اور محدود شکل میں گویا خود ہماری ذات کی صفات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (۲۱/۱۰ و دیگر مقامات) یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے (ذکر کے معنی عظمت و شرف بھی ہیں اور تذکرہ بھی)

اقبالؔ کے الفاظ میں۔

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

(۳) جوں جوں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا

ہے ۔ اس طرح خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں خدا بہر حال رفیقِ اعلیٰ ہوتا ہے۔

خدا اور انسان کا یہ تعلق قرآن کے علاوہ کہیں اور نہیں ملے گا۔ مشرق کے اہلِ مذاہب کے ہاں خدا کے ساتھ انسان کا تعلق اتنا ہی ہے کہ انسان خدا کی پرستش کرتا ہے کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے جسے انسان کو طوعاً و کرھاً ماننا ہے اگر کوئی اس کا حکم نہ مانے تو خدا ناراض ہو جاتا ہے۔ اسے راضی کرنے کے لئے اس کے حضور نذر نیاز گزارنا یا اس کے کسی "مقرب" کی وساطت سے اس تک سفارش پہنچانا ضروری ہے۔ جب وہ اس طرح خوش ہو جاتا ہے تو انسان کی مرادیں بر آتی ہیں۔ وہ ناراض رہتا ہے تو انسان مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔

اس کے برعکس، مغرب کے اربابِ فکر و نظر کے نزدیک خدا کا تعلق صرف خارجی کائنات سے ہے جس میں اس کے قوانین (قوانینِ فطرت کی شکل میں) کار فرما ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کا مطالعہ کرے اور ان کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے اپنے کام میں لائے۔ باقی رہی انسانی دنیا، سو اس میں انسانوں کو اپنے معاملات اپنی عقل و فہم کی رُو سے طے کرنے ہوں گے۔ ان کے لئے کوئی غیر متبدل اصول اور قوانین نہیں ہیں۔

اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ دنیا کے "خدا پرستوں" کے متعلق بھی قرآن کا یہ ارشاد کیوں ہے کہ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا (۲/۳۷)۔ اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو، تب سمجھئے کہ انہیں زندگی کا صحیح راستہ مل گیا۔" اگر یہ اس طرح ایمان نہ لائیں اور اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو مانتے رہیں۔ تو خدا کے رجسٹر میں ان کا شمار "اللہ کو ماننے والوں" میں نہیں ہو گا۔ یعنی قرآن کی رُو سے اسے ایمان باللہ نہیں کہا جائے گا۔ (ثـ)

ایمان باللہ کی حقیقت

ایمان کی حقیقت و بنیاد یہ ہے کہ جن الفاظ[1] ۔ صفات[2] ۔ اسماء[3] ۔ و افعال[4] کو اللہ تعالٰی نے خود سے منسوب کر کے اپنی تسلیمگی و معرفت کا ذریعہ قرار دیا ہے ان کو اللہ تعالٰی کی تسلیمگی ۔ عبادت و ذکر کے لئے استعمال کر کے اللہ تعالٰی کی نفی (کفر) سے پرہیز کیا جائے اور پھر ان کو مخلوق اوّل (امینِ افعالِ الٰہی) کا کمال قرار دے کہ اللہ تعالٰی خالقِ نورِ اوّل (خالقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ علیہم السلام) کو تمام حدودِ الفاظ[1] و صفت[2] و اسماء[3] و افعال سے منزہ و بالا قرار دے کر شرک سے (اللہ میں حدود و شریک کرنے سے) بچا جائے۔

جو اس بنیاد کو پاگیا اسے ایمان کی بنیاد مل گئی جس پر اعمالِ حسنہ کی عمارت قائم رہے گی اور نجات مل سکے گی جسے یہ بنیادِ ایمان ہی نصیب نہ ہوئی قدم قدم پر شرک کر کے جہنم کا ایندھن بنے گا۔ اور منافق اسی کو کہتے ہیں جو بظاہر (اعمال نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ کی رُو سے) مسلمان نظر آتا ہے لیکن ایمان کی روح اس کے دل میں اور ایمان کی خوشبو اس کے دماغ میں داخل ہی نہیں ہوئی۔ وہ بھٹکے ہوئے مویشی کی طرح صحرا میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر (یعنی جدھر منہ اُٹھے) بھاگتا پھرتا ہے اور اسے منزل کا نہ سراغ ملتا ہے نہ منزل ملتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○	وہ چوپاؤں کے مانند ہیں۔ بلکہ اُن سے بھی بدتر وہی لوگ (جو) غافل ہیں۔ (ع۱۱)

(الاعراف : ۱۷۹)

ایمان باللہ کے درجات

اس کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ چونکہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات وراء الوراء ہے اور بوجہ اپنی کمال لطافت اور غیر محدود ہونے کے انسان کی مادی آنکھوں کے احاطہ سے باہر ہے اور دوسری طرف ایمان کامل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی وہ کوئی زیادہ فائدہ دے سکتا ہے جب تک خدا کے متعلق انسان کم از کم اس درجہ کا یقین نہ پیدا کرے جیسا کہ دُنیا کی مادی چیزوں کے متعلق اُسے حاصل ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے اپنی حکیمانہ قدرت سے یہ مقدر کر رکھا ہے کہ ایک حد تک تو انسان اللہ تعالیٰ کی طرف قدم بڑھائے اور اُس کے بعد خدا خود انسان کی طرف نزول فرما کر اُسے اوپر اُٹھائے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ ایمان ہے جس تک انسان خود اپنی عقل کی مدد سے پہنچ سکتا ہے اور دوسرے وہ ایمان ہے جس تک مجرد عقل کی پہنچ نہیں بلکہ اس مقام کے لئے عقل کی امداد کے واسطے آسمان سے بعض اور چیزوں کا نزول ہوتا ہے اور تب جا کر انسان اُس ایمان کو حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○ (الانعام)

یعنی۔ انسانی بصارت خدا تک پہنچنے اور اس کا علم اور عرفان حاصل کرنے سے عاجز ہے۔ اس لئے خدا نے یہ انتظام کیا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو انسانی بصارت تک پہنچاتا ہے یعنی خود اپنی طرف سے ایسا انتظام فرماتا ہے کہ انسان خدا کا علم اور عرفان حاصل کر سکے کیونکہ اگر خدا لطیف ہونے کی وجہ سے انسان کی ظاہری نظر کی پہنچ

سے باہر ہے تو وہ خبیر بھی تو ہے اور جانتا ہے کہ انسان کی روحانی زندگی میرے عرفان کے بغیر ممکن نہیں۔ پس وہ
خود اپنی طرف سے ایسے سامان پیدا کرتا ہے کہ اس کے لطیف اور پوشیدہ ہونے کے باوجود انسان کو خدا کا
عرفان حاصل ہو سکے"

گویا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے مقابل میں خدا کی صفت لطیف کو رکھا گیا ہے۔ تاکہ یہ ظاہر ہو
کہ عقل کے ذریعہ خدا کا ادراک اس لئے ناممکن ہے کہ وہ لطیف ہے اور وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ
کے مقابل میں صفت خبیر کو رکھا گیا ہے یعنی یہ کہ خدا خود اپنی شناخت کا انتظام کرتا ہے کیونکہ وہ خبیر
ہے گویا اللہ تعالیٰ کی دو مقدم الذکر صفات یعنی لاتدرکہ الابصار اور وھو یدرک الابصار
اُس کی دو مؤخر الذکر صفات یعنی اللَّطِيفُ اور الْخَبِيرُ کا علی الترتیب طبعی نتیجہ ہیں۔

اب ایک طرف تو قرآن شریف کی یہ تعلیم ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں
کہ قرآن شریف میں بار بار لوگوں کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اس کائنات اور زمین آسمان اور
دیگر مخلوقات پر غور کرو اور سوچو کہ کیا یہ سب کارخانہ عالم معہ اپنے حکیمانہ نظام کے محض اتفاق کا نتیجہ ہو
سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ سارا نظام عالم پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ ضرور اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہونا چاہیئے۔ گویا اس
طرح قرآن شریف انسان کو بار بار ہستی باری تعالیٰ کے سوال پر غور کرنے اور مخلوق کے مطالعہ سے خالق کی ہستی کا پتہ لگانے
کی طرف متوجہ کرتا ہے اور یہ طریق استدلال ایسا ہے کہ اس کے متعلق محض عقل ہی کافی ہے کسی آسمانی تائید کی ضرورت
نہیں حالانکہ آیت محولہ بالا میں یہ بتاتی ہے کہ خدا کا ادراک انسانی بصارت کی طاقت سے باہر ہے اور اسی لئے خدا خود
آسمان سے ایسا انتظام فرماتا ہے کہ جس کی مدد سے انسان خدا کا علم اور عرفان حاصل کر سکے۔ اور یہ دونوں باتیں بظاہر
ایک قسم کے تضاد کا رنگ رکھتی ہیں مگر غور کیا جائے تو یہ کوئی تضاد نہیں بلکہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست
ہیں یعنی یہ بھی درست ہے کہ انسان عقل کی امداد سے خدا کی طرف راہ پا سکتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ مجرد
عقل خدا کا علم اور عرفان حاصل نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ خود آسمان سے آیات
اور مؤیدات کے ذریعہ اُس کی مدد فرمائے۔ اِس عقدہ کا حل اس طرح پر ہے کہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے
ایمان باللہ دو درجوں میں منقسم ہے۔ ابتدائی درجہ وہ ہے جس کا حصول مجرد عقل کی امداد سے ممکن ہے اور دوسرا
درجہ وہ ہے (اور دراصل شرعی اصطلاح میں ایمان باللہ اسی درجہ کا نام ہے) جس کا حصول مجرد عقل سے ممکن
نہیں بلکہ اس کے واسطے عقل کی امداد کے لئے خدا کی طرف سے خود خاص انتظام ہوتا ہے۔ پہلا درجہ ایمان کا
جو عقل سے حاصل ہو سکتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ہم عقلی دلائل سے اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اس
کائنات عالم کا کوئی خالق و مالک ہونا چاہیئے کیونکہ یہ سب کچھ جو ہم زمین و آسمان میں دیکھتے ہیں بغیر کسی خالق و

مالک کے خود بخود کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا وغیرہ ذلک۔ اور دوسرا درجہ ایمان کا یہ ہے کہ واقعی وہ خالق و مالک موجود بھی ہے اور اُس کی یہ یہ صفات ہیں اور اس تک انسان اِس طرح پہنچ سکتا ہے۔ گویا ایک مرتبہ ہونا چاہیئے کا ہے اور دوسرا ہے کا۔

اب خوب سوچ لو کہ مجرد عقل کبھی بھی ہمیں ہے کے مرتبہ تک نہیں پہنچا سکتی بلکہ اُس کا کام صرف اِس قدر ہے کہ وہ خدا کے متعلق ہونا چاہیئے تک کا یقین ہمارے اندر پیدا کر دے۔ گویا اگر غور کیا جائے تو مجرد عقل ہمارے اندر خدا کے متعلق ایمان نہیں پیدا کر سکتی مگر ہمیں ایمان کے لئے تیار کر سکتی ہے۔ وہ ہمیں خدا دکھا نہیں سکتی مگر خدا کی طرف دور سے اشارہ کر سکتی ہے۔ وہ ہمیں خدا سے ملا نہیں سکتی مگر خدا کی ملاقات کا دروازہ ہمارے لئے کھول سکتی ہے۔ وہ ہمارے اندر اطمینان نہیں پیدا کر سکتی لیکن اطمینان حاصل کرنے کے لئے جس تڑپ کی ضرورت ہے وہ ہمیں عطا کر سکتی ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں خدا کے متعلق یقین نہیں پیدا کر سکتی لیکن یہ یقین ضرور پیدا کر سکتی ہے کہ کوئی خدا ہونا چاہیئے۔ اس سے آگے لے جانا مجرد عقل کا کام نہیں کیونکہ اس مقام پر پہنچ کر عقل کے سامنے لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (یعنی بصارت انسانی خدا کا ادراک نہیں کر سکتی) کا آہنی دروازہ روک ہو جاتا ہے جہاں فرشتوں کا پہرہ ہے اور جب تک عقل کے پاس خدائی دربار کا خاص پاسپورٹ نہ ہو وہ آگے نہیں گزر سکتی۔ یا یوں سمجھو کہ عقل کی محدود نظر ہونا چاہیئے کے مقام تک پہنچ کر رُک جاتی ہے اور پھر جب تک خدا کی طرف سے اُسے ایک خاص عینک نہ عطا کی جائے وہ آگے نہیں گزر سکتی لیکن جب اُسے یہ خدائی عینک مل جاتی ہے تو پھر ایسا ہوتا ہے کہ گویا تمام پردے جو رستہ میں روک ہوتے ہیں پھٹ جاتے ہیں اور وہی نظر جو اس سے قبل درماندہ ہو کر واپس لوٹ لوٹ جاتی تھی اب سیدھی خالق ہستی کے منور چہرہ پر پڑنی شروع ہوتی ہے اور جُوں جُوں انسان قریب ہوتا جاتا ہے اس کا یہ منظر زیادہ صاف ہوتا جاتا ہے اور علم اور عرفان ترقی کرتے جاتے ہیں مگر اس قرب کی کوئی حد نہیں اور نہ اس علم و عرفان کی کوئی انتہا ہے کیونکہ خدا غیر محدود ہے اور غیر محدود کا عرفان بھی محدود نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (یعنی اے میرے رب! میرے علم میں ترقی دے) کی دُعا جس طرح زید و بکر کے مُنہ سے نکلتی ہے اسی طرح حضرت سرورِ کائنات خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے بھی نکلتی تھی جس کی زبان پر خدا نے یہ الفاظ جاری فرمائے کہ انا سید ولد ادم ولا فخر (یعنی میں تمام بنی آدم کا سردار ہوں مگر میں اِس کی وجہ سے تکبّر نہیں کرتا) اور جس کے متعلق خدا نے فرمایا کہ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (یعنی ہمارا بندہ ہم سے قریب ہوا اور اتنا قریب ہوا کہ گویا ہم میں نہاں ہو گیا)

مگر افسوس کہ اکثر لوگ جب ایمان کے ابتدائی مرتبہ کو حاصل کرتے ہیں تو یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں

کہ بس ہم نے جو کچھ پانا تھا پالیا اور اس سے بھی زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ دنیا میں بیشتر حصہ ان لوگوں کا ہے جو اگر خدا تعالیٰ کے متعلق توجہ کرتے ہیں تو ہونا چاہیئے کے مرتبہ سے آگے نہیں گذرتے اور صرف اِسی مقام تک پہنچ کر یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ہم نے خدا کو پالیا حالانکہ گو اس میں شک نہیں ہے کہ ہونا چاہیئے کا مرتبہ ہے کے مرتبہ کے لئے بطور ایک زینہ کے ہے اور عالمِ روحانیات میں انسان کو ابتدائی بیداری اسی مقام میں پہنچ کر حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس مقام پہ پہنچ کر انسان آگے قدم بڑھانے سے رُک جائے اور اسی کو اپنا منتہیٰ اور مقصود سمجھنے لگ جائے تو یہی حالت اُس کے واسطے نہایت خطرناک اور مہلک بھی ثابت ہو سکتی ہے اور بسا اوقات اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قدموں پر واپس لوٹ کر ہمیشہ کے لئے دہریت کے تاریک گڑھے میں گِر جاتا ہے اور خدا کو تلاش کرنا کرنا خدا کا منکر ہو بیٹھتا ہے اور اسی انکار کی حالت میں اُس پر موت آجاتی ہے کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ باوجود اس قدر کوشش اور سعی کے وہ خدا کو نہیں پا سکا اور زیادہ سے زیادہ اس خیال تک پہنچ سکا ہے کہ کوئی خدا ہونا چاہیئے تو آخر آہستہ آہستہ مایوسی اُس پر غلبہ پانا شروع کرتی ہے اور بالآخر وہ اپنی عقل کی ہدایت کو ایک دھوکہ خیال کر کے خدا تعالیٰ کا منکر ہو جاتا ہے۔ اِس کی ایسی ہی مثال سمجھنی چاہیئے جیسے کہ کوئی شخص کسی کمرے کے دروازے کو اندر سے بند پائے اور اُس سے وہ یہ استدلال کرے کہ اِس کمرے کے اندر ضرور کوئی شخص ہونا چاہیئے ورنہ اس کا دروازہ خود بخود اندر سے بند نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ ایک بہت بڑا لمبا عرصہ اُس دروازہ کے سامنے کھڑا رہے اور اس کو کھٹکھٹائے اور آوازیں دے اور شور کرے لیکن وہ دروازہ اس کے لئے نہ کھولا جائے اور نہ ہی اُسے اندر سے کوئی آواز آئے تو آہستہ آہستہ اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے کہ ممکن ہے یونہی کسی نامعلوم بات کے نتیجے میں یہ دروازہ اندر سے بند ہو گیا ہو یا یہ کہ کرنے والا اندر ہی مر چکا ہو وغیرہ وغیرہ اور بالآخر ایک وقت اُس پر ایسا آئے گا کہ وہ بالکل مایوس ہو جائے گا اور اس یقین سے واپس لوٹ جائیگا کہ کمرے کے اندر کوئی آدمی نہیں ہے۔

پس خدا کے متعلق بھی اگر ہونا چاہیئے والا ایمان ہے والے ایمان کی طرف رہنمائی نہیں کرتا تو اس کا آخری نتیجہ بھی سوائے مایوسی اور دہریت کے اور کوئی نہیں۔ اور جو لوگ غور کا مادہ رکھتے ہیں اُن کے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس مقام تک پہنچ کر رُک جائیں۔ وہ یا تو آگے قدم بڑھائیں گے اور یا کچھ عرصہ کے بعد مایوس ہو کر واپس لوٹ جائیں گے۔ لیکن افسوس کہ دُنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں (بلکہ انہی لوگوں کی کثرت ہے) کہ جن کی آنکھوں پر ایسا غفلت کا پردہ چھایا ہوتا ہے کہ وہ اس مقام تک پہنچ گئے ہیں اور جو کچھ ہم نے پانا تھا پالیا ہے۔ گویا اپنی نادانی اور غفلت اور جہالت سے وہ خدا تعالےٰ کے متعلق اس حد تک عرفان کافی سمجھتے ہیں کہ اس کارخانہ کا کوئی خالق ہونا چاہیئے اور اُن کا ذہن پوری بیداری کے ساتھ اس بات کی طرف جاتا ہی

نہیں کہ اگر کوئی خالق ہونا چاہیئے تو وہ ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو کون ہے۔ کہاں ہے۔ کیا کیا صفات رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم کس طرح تعلق پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ہمیں کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس کا بھی ہمارے ساتھ کوئی تعلق ہے، ایسے لوگ نہ تو آگے قدم بڑھانے کی فکر کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی اس جھوٹی تسلی کی وجہ سے پیچھے لوٹتے ہیں اور ان کی موت اسی حالت میں اُن کو آلیتی ہے کہ وہ راستہ پہ تھکا بیٹھے ہوئے سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم منزلِ مقصود تک پہنچ چکے ہیں۔ آج کل خدا کے ایمان کا دم بھرنے والے اکثر لوگ اِسی قسم میں داخل ہیں۔ آہ! بدقسمت انسان! تو نے عقل کے مدھم اور کمزور چراغ سے روشنی پاکر ایک حد تک راستہ طے کیا اور پھر جب وہ وقت آیا کہ تو خدا کے روحانی سورج کی زبردست کرنوں کی روشنی میں داخل ہوکر خدا کی طرف (گرتا پڑتا نہیں بلکہ) شوق سے دوڑتا بھاگتا ہوا قدم بڑھائے اور ابتداءً دور سے اپنے آقا و مولیٰ کو شناخت کرکے پھر اس کے قریب ہوتا چلا جائے حتیٰ کہ اُس کی مقدس صفات تجھے ماں کی گود کی طرح اپنے اندر ڈھانک لیں تو تُو یہ خیال کرکے کہ میں نے خدا کو پالیا ہے وہیں اپنی عقل کے مدھم چراغ کی کمزور روشنی میں راستہ سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا اور وہیں اپنی زندگی کے دن گذار دیئے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تیرا دل جس کے اندر خالقِ فطرت نے یقین کی ایسی پیاس ودیعت کر رکھی ہے جو بغیر حقیقی اطمینان کے تسلی نہیں پاتی اور جس میں عشق و محبت کی وہ آگ بھڑکائی گئی ہے جو بغیر خدا کی طرف سے محبت کا چھینٹا پڑنے کے نہیں بجھتی کس طرح بغیر اپنا مقصود حاصل کرنے کے تسکین پاسکتا ہے، تُو اگر دھوکا نہیں دیتا تو یقیناً دھوکا خوردہ ہے اور یاد رکھ کہ بعض صورتوں میں دھوکا کھانا بھی انسان کو مجرموں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ پس خدا سے ڈر اور راستہ میں بیٹھا رہ کر اپنی ہلاکت اور دوسروں کی گمراہی کا موجب نہ بن۔ (ماخذ)

ایمان باللہ کی لغوی ضرورت

ایمان باللہ کی عقلی، نفسی، اجتماعی، سیاسی اور لغوی ضرورت ہے لیکن یہ سوال بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ ایمان باللہ لغوی ضرورت کیسے ہوسکتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ معانی اوّل وجود میں آتے ہیں اور بعد میں ان کے لئے الفاظ وضع کئے جاتے ہیں یا الفاظ پہلے وضع کئے جاتے ہیں اور معانی بعد میں؟

تو اصلی بات یہ ہے کہ معانی پہلے وجود میں آتے ہیں اور الفاظ ان کے لئے بعد میں وضع کئے جاتے ہیں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ امور عدمیہ (وہ امور جن کا وجود نہیں ہوتا) کے لئے الفاظ وضع نہیں کئے جاسکتے مثلاً ٹیلی ویژن، فریج اور ٹیپ ریکارڈر جب ایجاد نہیں ہوئے تھے تو ان کے لئے نام بھی وضع نہیں ہوئے تھے۔ ان چیزوں کی ایجاد کے بعد ان کے لئے مذکورہ نام تجویز کئے گئے

ہم اپنی بات کے ثبوت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلے خدا نے فرشتوں کے سامنے اشیاء کو پیش کیا۔
قرآن میں ہے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ
(البقرۃ ۳۲) اور بعد میں حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے نام بتا دیئے گویا کہ آیت کی روشنی میں معانی
پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور الفاظ یا نام ان کے لئے بعد میں وضع کئے جاتے ہیں۔

اس تمہید کی روشنی میں اب اگر خدا پر ایمان نہ والوں سے پوچھا جائے کہ لفظ اللہ ان کی زبان پر کہاں سے آیا اور یہ لفظ انسان کی لغت میں کیسے شامل ہوا؟ اگر اللہ ایک امر عدمی ہے۔ یعنی اس کا کوئی وجود نہیں ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ جن اشیاء کا وجود نہیں ہوتا ان کے نام بھی نہیں ہوتے تو لفظ اللہ ساری لغتوں میں کیسے داخل ہوا؟ تو جواب یہ ہے کہ اللہ پاک نے پہلے انسان کو علم لغت سے نوازا۔ پھر اس انسان نے ذات الٰہی سے انکار کر دیا اور یہ کس لئے؟ اس لئے کہ لوگ عام طور پر اشیاء محسوسہ کے ساتھ مانوس تھے اور غیر محسوس یعنی غائب اشیاء کے ساتھ غیر مانوس اور یہ اس لئے کہ غائب یا غیر مانوس اشیاء اس کی نظروں سے غائب ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے لغوی فلسفے میں کلمۂ کفر دلیل مخالف کے طور پر بذات خود ایمان باللہ کی دلیل ہے کیسے؟ لغت میں کفر کا معنی ستر یعنی چھپانا ہے۔ جب کفر کے معنی چھپانا ہے تو ضرور کوئی ایسی شئے موجود ہے جس کو چھپایا جاتا ہے اور جس چیز کو چھپایا جاتا ہے وہ ایمان ہے

مطلب یہ کہ کلمہ "اللہ" اور کلمہ "کفر" دونوں ایمان باللہ پر دلالت کرتے ہیں اس طرح نفس کفر بھی مومن ہے۔ اس لئے کہ کفر کے معنی یہ ہیں کہ یہ کسی چیز کے وجود سے انکار ہے۔ اور جب تک کفر کا کلمہ "لَا اِلٰـهَ" کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نکالا جائے کہ اللہ موجود ہے۔ گویا کہ لفظ توحید ایمان باللہ پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اس کا مد مقابل لفظ "کُفر" بھی ایمان باللہ پر دلالت کرتا ہے (۳۷)

ایمان باللہ فطری ہے

ایمان باللہ ہر ایک انسان کے تحت الشعور میں داخل ہے اور یہ انسان کی اصلی فطرت ہے۔ یہ اصلی فطرت۔ ایمان باللہ۔ شہوات نفسانی۔ طمع اور دوسری کثیر خواہشات کے پردوں میں پوشیدہ پڑی رہتی ہے جب کبھی اس پر خطرات اور مشکلات آتی ہیں تو یہ پردے ہٹ جاتے ہیں اور انسان کی اصلی فطرت نمودار ہو جاتی ہے ایک اعرابی سے کسی نے خدا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا مینگنی اونٹ کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے اور پاؤں کی نشانی ایک جانے والے کی موجودگی پر۔ کیا یہ آسمان و زمین ایک خالق کی موجودگی

پر دلالت نہیں کرتے۔

ایمان باللہ انسان کی فطرت ہے۔ اور خدا نے انسان کو اسی فطرت پر پیدا کیا ہے اور یہ ایک ضروری امر ہے۔ اور جب سختی کی گھڑی آتی ہے تو خدا کے وجود سے انکار کرنے والے خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ماسوائے خدا کے اور سارے معبودوں سے بیزاری کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

جب کشتی ڈوبتی ہے۔ یا آگ لگ جاتی ہے یا اور کوئی بڑا خطرہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے یا سخت بیماری آتی ہے تو خدا کے وجود سے انکار کرنے والے دین کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ۔ (الاسراء - ٦٧)

(اور جب آپ کو سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو سوائے خدا کے باقی آپ کے سارے معبود غائب ہو جاتے ہیں)

کہتے ہیں کہ جب ایک مادہ پرست کو موت آتی ہے تو پھر وہ صرف اللہ کو بلاتا ہے یہاں تک کہ لینن اور مارکس پر جب نزع کی حالت طاری ہوئی تو وہ بھی اللہ کو بلانے لگ گئے۔ لیکن ایسے وقت اللہ اللہ کہنا ان کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی طرح فرعون نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ (أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ) لیکن جب سمندر کی موجوں نے گھیر لیا تو کہنے لگا: امنت بالذی امنت بہ بنو اسرائیل (میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لاتا ہوں)

خدا نے ہمیں اپنی کتاب میں تنبیہہ کی ہے کہ خدا کے وجود کی دلیل ہمارے اپنے نفسوں میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۔ اب کافر خدا کے وجود سے کیسے انکار کر سکتا ہے جبکہ اس کے وجود کا ثبوت خود اس کے اپنے نفس میں موجود ہے۔

اگر اس کافر سے پوچھا جائے کہ اس نے اپنا نفس خود پیدا کیا ہے۔ کیا وہ رحم مادر میں خود داخل ہوا ہے۔ کیا اس نے اس عورت کو اپنی مرضی سے اپنی ماں بنا دیا ہے۔ کیا وہ خود ایک دائی کے پاس گیا ہے۔ تاکہ وہ اس کو بحفاظت رحم مادر سے نکالے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کسی کافر کو عدم سے بغیر کسی فاعل اور خالق حقیقی کے وجود میں لایا جائے اور کیا، اے انسان! یہ ساری مادی مخلوق آپ نے پیدا کی ہے؟

ڈیکارٹ نے جب تشکیک کا مذہب پھیلایا اور ہر ایک چیز میں شک کرنے لگا۔ تو اس سلسلے میں وہ اپنے نفس تک پہنچا۔ پھر وہ اپنے نفس میں شک نہ کر سکا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی وہ نفس ہے جو شک کرتا ہے اور شک کے لئے شک کرنے والے کا وجود ضروری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی یہ بات مشہور ہو گئی۔

ایمان باللہ کے عظیم الشان فوائد

اس کے بعد مَیں ہستی باری تعالیٰ کے متعلق چند ایسے دلائل بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس اصول پر مبنی ہیں کہ خدا پر ایمان لانا اپنے اندر بعض ایسے اہم فوائد رکھتا ہے جو بغیر اس پر ایمان لانے کے کسی اور طریق سے پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں جب کوئی چیز اختیار کی جاتی ہے تو اس اصول پر کی جاتی ہے کہ وہ کس حد تک مفید اور نفع بخش ہے اور بنی نوع انسان پر اس چیز کا اختیار کرنا کیا فائدہ مند اثر پیدا کرتا ہے۔ پس اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ خدا پر ایمان لانا نسلِ انسانی کے لئے بہت مبارک اور نفع بخش ہے تو ہر عقلمند اس بات سے اتفاق کرے گا کہ اس صورت میں اور نہیں تو صرف اس فائدہ کی خاطر ہی خدا کے عقیدہ کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔

بے شک ان دلائل سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ اس دنیا کے اوپر کوئی خدا ہے یا ہونا چاہیئے لیکن ان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ خدا کا عقیدہ نسلِ انسانی کی ترقی اور بہبودی کے لئے نہایت مفید ہے اور چونکہ مفید چیز اختیار کی جانی چاہیئے اس لئے یہ دلائل بھی ہستی باری تعالیٰ کی تائید میں بالواسطہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ گویا جس طرح میں نے عقلی دلائل کے شروع میں ایک احتیاطی دلیل بیان کی تھی جو اس اصل پر مبنی تھی کہ چونکہ خدا پر ایمان لانے میں کوئی نقصان نہیں اور انکار کرنا نقصان کے احتمالات رکھتا ہے اس لئے ایمان لانا اقرب بالامن ہے اِسی طرح عقلی دلائل کی بحث کے اختتام پر میں یہ دوسری قسم کے احتیاطی دلائل بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس اصول پر مبنی ہیں کہ چونکہ خدا کا عقیدہ نسلِ انسانی کے لئے مفید اور نفع بخش ہے اس لئے ایمان لانا بہر حال بہتر اور قابل ترجیح ہے۔ لیکن اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہاں اُن عظیم الشان فوائد سے بحث نہیں جو مذہبی یا روحانی طور پر ایمان باللہ اور تعلق باللہ سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً خدا کے ساتھ ذاتی تعلق کا قیام۔ اُس کی تائید و نصرت کا حصول۔ علم و عرفان کی ترقی۔ اُخروی نجات وغیرہ وغیرہ بلکہ یہاں صرف ان اصولی فوائد کا ذکر ہے جو خدا تعالےٰ پر معقولی طور پہ ایمان لانے کے نتیجے میں بنی نوع انسان کو عام طور پر حاصل ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں اور اس لئے اس جگہ صرف ان مؤخر الذکر فوائد کا ہی ذکر کیا جائے گا۔

ایمان باللہ وحدت اور اخوت کا جذبہ پیدا کرتا ہے

سب سے پہلے جو فائدہ ایمان باللہ کا میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خدا کا خیال لوگوں کے دلوں میں وحدت و

اخوت کے جذبات پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور یہ جذبات نسلِ انسانی کی ترقی اور بہبودی کے لئے نہایت درجہ ضروری اور مفید ہیں۔ دُنیا کے امن اور اقوامِ عالم کی خاطر خواہ ترقی و بہبودی کے لئے یہ بات ازبس ضروری بلکہ لابدی ہے کہ مختلف اقوام باہم محبت اور اخوت اور تعاون کے ساتھ رہیں اور ایک دوسرے کے خلاف بے جا تعصب کو اپنے دل میں جگہ نہ پکڑنے دیں بلکہ حتی الوسع دوسروں کے متعلق ہمدردی اور قربانی اور ایثار کا طریقہ اختیار کریں اور اسی طرح افراد کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے متعلق محبت اور اخوت اور ہمدردی اور تعاون کی روح پیدا کریں کیونکہ بغیر اس روح کے جو افراد اور اقوام ہر دو کے واسطے ایک سی ضروری ہے دنیا میں امن کا قیام اور نسل انسانی کی خاطر خواہ ترقی و بہبودی محال ہے۔ پس ہر ایک بہی خواہ نسل آدم کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام ایسے ذرائع اختیار کرنے کے درپے رہے جن سے کہ باہم وحدت و اخوت کی روح پیدا ہوتی اور ترقی کرتی رہے اور بغض اور حسد اور بے جا رقابت اور تعصب کے خیالات دلوں میں جاگزیں نہ ہونے پائیں اور جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے ان ذرائع میں خدا کا عقیدہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قطعی الاثر ذریعہ ہے

واقعی یہ عقیدہ کہ ہم سب لوگ باوجود اپنے کثیر التعداد اور گوناگوں اختلاف کے ایک واحد قادر و متصرف مدرک بالارادہ خدا کی مخلوق و مملوک ہیں اور ہم سب کا ملجاء و ماویٰ وہی یکتا ہستی ہے جس کے قبضۂ تصرف سے دنیا کی کوئی چیز باہر نہیں جس مضبوطی اور جس پختگی اور وضاحت کے ساتھ ہمارے دلوں میں باہم محبت و وحدت و اخوت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا بے شک ایک ملک کا باشندہ ہونا یا ایک قوم سے تعلق رکھنا یا ایک نظام حکومت کے ماتحت ہونا وغیر ذالک یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ جو کم و بیش وحدت و اخوت کا موجب ہوتی ہیں لیکن سب سے بڑھ کر یہ ایمان ہے کہ ہم ایک واحد خالق کی پیدا کردہ ہستیاں اور ایک واحد منبعِ فیوض سے جاری شدہ نہریں ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمارا یہ مالک و آقا ایک فوت شدہ باپ کی طرح نہیں جس کے بعد نالائق بیٹے بعض اوقات آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ وہ اب بھی ہمارے سروں پر زندہ سلامت موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ ایمان تمام بنی نوع آدم کو فوراً بھائی بھائی بنا کر ایک صف میں کھڑا کر دیتا ہے اور اس یقین کے پیدا ہوتے ہی دل کی تمام کدورتیں اور کینے اور باہم بغض و عداوت کے خیالات کافور ہونے اور اُن کی جگہ محبت و اخوت اور ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور قربانی کے جذبات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ خدا پر ایمان لانا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اپنے آپ کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھنا بلکہ حق یہ ہے کہ خدا کو مان کر پھر بندہ کا تعلق خدا کے ساتھ ایسا گہرا اور ایسا وسیع تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس کی مثال دنیاوی رشتوں میں پائی جانی ممکن نہیں۔

الغرض خدا پر ایمان لانا باہم محبت و اخوت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے ایک ایسا زبردست

ذریعہ ہے جس کے مقابلہ میں باقی تمام ذرائع ہیچ ہیں۔ بے شک جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے ملک اور قوم وغیرہ کے خیالات بھی یہ جذبہ پیدا کرتے ہیں لیکن اوّل تو اُن کا اثر ایسا قوی اور گہرا نہیں ہوتا اور دوسرے یہ کہ وہ صرف ایک محدود حلقہ میں یہ اثر پیدا کر سکتے ہیں اور تمام نسلِ انسانی کے اندر محدود حلقہ میں یہ اثر پیدا کر سکتے ہیں۔ اور تمام نسلِ انسانی کے اندر مشترکہ طور پر ایسے جذبات پیدا کرنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ بلکہ بسا اوقات ان کا اثر فرقہ بندی اور قوم پرستی اور بے جا تعصب اور حسد کی صورت میں ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے جو بجائے مفید ہونے کے اُلٹا نقصان دہ ہوتا ہے۔ پس صرف خدا کا عقیدہ ہی ایسا ذریعہ ہے جو نسلِ انسانی کے اندر عالمگیر صورت میں وحدت واخوت کے جذبات پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے اور اگر ہم خدا کا خیال لوگوں کے دلوں سے الگ کر لیں تو یہ وحدت و اخوت کے خیالات فوراً غائب ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور لوگوں کے درمیان صرف ضابطہ اور معاملہ کے خشک تعلقات باقی رہ جاتے ہیں جو کبھی بھی قلوب کے اندر کوئی جذباتی رشتہ پیدا نہیں کر سکتے۔ خوب غور کرو کہ اگر خدا کوئی نہیں اور ہر انسان خود بخود اپنے آپ سے ہے اور ایک مستقل اور آزاد ہستی رکھتا ہے تو پھر نہ کوئی اخوت رہ سکتی ہے اور نہ کوئی وحدت بلکہ خودغرضی اور بے جا رقابت اور حسد کا دَور دَورہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو دنیا میں امن شکنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ وہ بات جو یقینی اور قطعی طور پر تمام نسلِ انسانی کے اندر اخوت کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے وہ صرف خدا کا خیال ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اس عقیدہ کو الگ کر کے پھر بھی دنیا میں یہ جذبہ عالمگیر صورت میں ایک زندہ حقیقت کے طور پر قائم رہ سکے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہر شخص جو خدا پر ایمان لانے کا مدعی ہے باہم اخوت و وحدت کے جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے کیونکہ دُنیا میں سینکڑوں ہزاروں لاکھوں چیزیں انسان کی حالت پر اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ بعض دوسرے بواعث کی وجہ سے ایک خدا پر ایمان لانے والے شخص کا دل بھی ان پاکیزہ جذبات سے خالی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی آدمی کے دل میں خدا کا خیال ایک ایسا کمزور خیال ہو جو اس کے دل و دماغ پر اتنا اثر پیدا نہ کر سکے کہ جو اخوت و وحدت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اصولی طور پر خدا کا عقیدہ اِن جذبات کے پیدا کرنے والے موجبات میں سب سے اہم اور بڑا ہے اور اگر کوئی دوسرے موانع نہ پیش آ جائیں تو یقیناً ایک مومن باللہ ایک کافر باللہ کی نسبت نسلِ انسانی کا زیادہ ہمدرد زیادہ خیرخواہ زیادہ محبت کرنے والا ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جو دل سے خدا پر ایمان لاتا ہے اس بات کی شہادت دے گا کہ خدا کا خیال اس کے دل میں بڑے زور کے ساتھ اخوت اور وحدت کے جذبات پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور نہ صرف پیدا کرتا ہے بلکہ ان جذبات کا اثر اس کے اعمال میں بھی رونما ہوتا ہے۔

اور اگر وہ اپنے نفس کے مطالعہ کا عادی ہو تو اس کا دل پورے یقین کے ساتھ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اگر نعوذ باللہ خدا کا خیال الگ کر لیا جائے تو پھر کبھی بھی اس کی یہ حالت نہیں رہ سکتی اور انسان تو انسان ہے ادنیٰ قسم کے حیوانات بلکہ نباتات اور جمادات کے ساتھ بھی یہ عقیدہ ایک قسم کی محبت اور موانست اور اپنا ہٹ کے جذبات پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

انگریزی میں ایک مثل ہے "لَو مِی لَو مائی ڈاگ"[ا] یعنی اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو میرے کُتے سے بھی محبت کرنی ہوگی۔ یعنی جن چیزوں کا میرے ساتھ تعلق ہے ان کو بھی اپنی محبت میں شریک کرنا ہوگا۔ یہ مثل فطرتِ انسانی کے صحیح مطالعہ پر مبنی ہے۔ واقعی اگر ہمیں خدا پر ایمان اور خدا کے ساتھ تعلق ہے پھر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ہمارا دل مخلوقات اور خصوصاً انسان کی محبت سے خالی رہ سکے۔ میں اس بات کو قبول کر سکتا ہوں کہ ایک شخص جو خدا پر ایمان لانے کا مدعی ہے وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا یا دھوکا خوردہ ہے لیکن یہ بات میں ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کر سکتا (کیونکہ یہ فطرت انسانی کے خلاف ہے) کہ جو شخص واقعی خدا پر ایمان لاتا ہے اس کا دل مخلوقات کی محبت وہمدردی کے خیالات سے خالی رہ سکتا ہے اور تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو سب سے زیادہ پختگی اور یقین کے ساتھ ایمان باللہ پر قائم ہوئے ہیں وہی لوگ ہیں جو ہمدردیٔ خلق اور محبت بنی نوع انسان کے جذبات میں سب سے اعلیٰ مرتبہ پر تسلیم کئے جاتے ہیں اور جُوں جُوں لوگ اس ایمان میں کمزور ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ الغرض اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ خدا کا عقیدہ نسلِ انسانی میں وحدت و اخوت کے جذبات پیدا کرنے کا سب سے مضبوط اور یقینی اور سریع الاثر ذریعہ ہے اور چونکہ وحدت و اخوت کے خیالات دنیا میں قیامِ امن اور اقوامِ عالم کی خاطر خواہ ترقی وبہبودی کے لئے نہایت ضروری ہیں اس لئے اس جہت سے بھی ہر عقلمند انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مفید اور بابرکت عقیدہ کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ وہو المراد۔

اس جگہ کسی شخص کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا کے منکرین بھی بسا اوقات دوسروں کے ساتھ محبت وہمدردی کا سلوک کرتے اور رفاہِ عام کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جذبات کے پیدا کرنے کے لئے خدا پر ایمان لانا ضروری نہیں ـــــ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ یہ جذبات سوائے ایمان باللہ کے اور کسی ذریعہ سے پیدا ہی نہیں ہو سکتے بلکہ ہم تو خود اس بات کے قائل ہیں کہ بہت

ا Love me Love my dog.

سی چیزیں کم و بیش اس کا موجب ہوتی ہیں لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ تمام بنی نوع آدم میں مجموعی طور پر اکمل و اتم صورت میں یہ جذبات صرف ایمان باللہ کے نتیجہ میں ہی پیدا ہو سکتے ہیں اور باقی ذرائع اپنی کیفیت اور کمیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پس ہمارا دعویٰ صرف اس صورت میں غلط ثابت ہو سکتا ہے جب کہ یہ بات ثابت کی جائے کہ یا تو از روئے عقل خدا کا عقیدہ اخوت و وحدت کے خیالات کا موجب ہو ہی نہیں سکتا اور یا یہ کہ تجربہ اور مشاہدہ کی رو سے یہ دکھایا جائے کہ خدا پر ایمان لانے والوں کی نسبت خدا کا انکار کرنے والے لوگ نسلِ انسانی کے زیادہ ہمدرد زیادہ خیر خواہ اور زیادہ محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور جب تک ان دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ثابت نہ ہو جائے اُس وقت تک کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ محض اس بنا پر کہ ایک دہریہ بھی ایک حد تک یہ جذبات رکھتا ہے یہ غیر طبعی استدلال کرے کہ خدا کا عقیدہ اِن جذبات کے پیدا کرنے کا موجب نہیں یا یہ کہ دہریت اِن خیالات کے پیدا کرنے کی موجب ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی ہوش و حواس رکھنے والا انسان ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ خود اپنی ذات میں دہریت ان خیالات کا موجب ہو سکتی ہے یا یہ کہ خدا کا عقیدہ ایسے جذبات پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں باتیں اس قدر بیّن طور پر غیر طبعی اور خلافِ فطرت ہیں کہ کوئی عقلمند آدمی انہیں قبول نہیں کر سکتا۔ خدا کا وجود (اگر اسے صحیح صورت میں تسلیم کیا جائے) وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں پہنچ کر تمام مخلوقات بالآخر جمع ہو جاتی ہے اور وحدت اور جمعیت کا خیال اس نقطہ کے ساتھ لازم و ملزوم کے طور پر لگا ہوا ہے اور اسے نظر انداز کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ اس کائنات کو بغیر کسی مرکز یا منبع کے تسلیم کیا جائے اور اس خیال کے آتے ہی وحدت و یگانگت کے خیالات کافور ہونے شروع ہو جاتے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک باپ کی اولاد ہونا وحدت و اخوت کا موجب نہیں ہو سکتا بلکہ مختلف باپوں کی اولاد ہونا اس کا موجب ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ پس اگر کبھی مختلف باپوں کے بیٹے آپس میں صلح اور محبت کا طریق رکھتے ہیں تو ہم اس سے یہ غیر طبعی نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ایک باپ کی اولاد ہونا محبت و اخوت کا موجب نہیں ہوتا بلکہ اس صورت میں ہم یہ سمجھیں گے کہ اس جگہ کوئی اور موجبات اثر ڈال رہے ہیں جنہوں نے باوجود مختلف باپوں کے بیٹے ہونے کے اُن کو ایک نقطہ پر جمع کر رکھا ہے۔ نہ یہ کہ مختلف باپوں کی اولاد ہونے نے یہ اثر پیدا کیا ہے۔ اسی طرح ہر عقلمند تسلیم کرے گا کہ اگر یہی مختلف باپوں کے بیٹے جنہیں بعض وجوہات نے باوجود اس اختلاف کے وحدت و یگانگت کی لڑی میں پرو رکھا ہے ایک ماں باپ کی اولاد ہوتے تو پھر اُن کی باہمی محبت و اخوت بہت زیادہ اکمل و اتم صورت میں ظاہر ہوتی۔ پس اگر خدا کے منکرین بھی بعض حالات میں نسلِ انسانی کے ساتھ محبت و ہمدردی کا طریق اختیار کرتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب ہمیں

خدا کے عقیدہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ جذبات اپنی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے اکمل اور اتم صورت میں تبھی ظاہر ہو سکتے ہیں کہ جب وہ اور موجباتِ وحدت کے لوگ خدا کے عقیدہ پر بھی قائم ہوں اور اپنے آپ کو ایک واحد منبعِ خلق سے پیدا شدہ ہستیاں اور ایک واحد چشمۂ حیات سے جاری شدہ نہریں تسلیم کریں۔

میرے عزیزو! میں تمہیں یہ کس طرح یقین دلاؤں کہ خدا پر ایمان لانا بشرطیکہ وہ حقیقی اور زندہ ایمان ہو انسان کے دل میں بنی نوع آدم کی محبت اور خیر خواہی اور اُن کے ساتھ جذبۂ اخوت کا ایک ایسا وسیع سمندر موجزن کر دیتا ہے کہ جس کی کسی دوسری جگہ نظیر ملنی ناممکن ہے اور ان جذبات کے پیدا ہونے کے لئے باقی جتنے بھی موجبات ہیں وہ اس کے مقابل میں اپنی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔

اور یہ سوال کہ ایک دہریہ ایسے جذبات کیوں رکھتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً اس کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ دہریہ اپنے اردگرد کے مذاہب کی تعلیم سے محسوس طور پر یا غیر محسوس طور پر متأثر ہو کر اس نتیجہ پر قائم ہوتا ہے کہ نسلِ انسانی کی ہمدردی اور محبت ایک مستحسن فعل ہے جسے اگر وہ اختیار نہ کرے تو وہ لوگوں کی نظر سے گر جائے گا اور اس صورت میں علاوہ اس کی ذاتی بدنامی کے لوگوں کو اس کے عقائد پر بھی یہ حرف گیری کا موقعہ ملے گا کہ چونکہ یہ شخص دہریہ ہے اس لئے اس کے دل میں بنی نوع انسان کے متعلق محبت و اخوت کے جذبات نہیں ہیں۔ پس دانستہ یا نادانستہ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کسی ایسے فعل میں جو مسلّمہ طور پر مستحسن سمجھا جاتا ہے وہ ان لوگوں سے پیچھے نہ رہے جو خدا کے قائل ہیں گویا مقابلہ کا خیال اور بدنامی کا ڈر اس سے یہ کام کرواتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اُس صورت میں اس کے اندر کبھی بھی یہ جذبات اعلیٰ اور اکمل صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتے اور وہ بے لوث اور بے غرضانہ اور طبعی رنگ پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک خدا پر ایمان لانے والے شخص میں پایا جاتا ہے اس کی محبت ایسی ہی محبت ہوتی ہے جیسا کہ ایک سوتیلی ماں اپنے خاوند کو خوش کرنے کے لئے یا محلہ والوں میں بدنامی سے بچنے کے لئے اپنے خاوند کی فوت شدہ بیوی کے بچوں سے کرتی ہے مگر دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ کجا ماں کی طبعی محبت جو ایک قدرتی چشمہ کے طور پر اس کے سینہ میں اُبلتی رہتی ہے اور کجا سوتیلی ماں کا ظاہر داری کا سلوک۔ والشاذ کالمعدوم۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح دہریہ بھی اس بات کو سمجھتا اور محسوس کرتا ہے کہ نسلِ انسانی کی ترقی و بہبودی اور سوسائٹی کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ لوگ آپس میں محبت اور سلوک سے رہیں اور باہم تعاون کا طریق اختیار کر کے ایسے کاموں میں حصہ لیں جو لوگوں کی جسمانی اور اخلاقی اور علمی اور اقتصادی بہبودی کا موجب ہیں پس دنیا کے ایک شہری ہونے کی حیثیت میں بھی ایک دہریہ اس قسم کے خیالات اور جذبات پیدا کرنے کی

کوشش کرتا ہے اور اس قسم کے کاموں میں دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی ایک ضابطہ اور معاملہ کا رنگ رکھتی ہے اور وہ طبعی اور جذباتی رشتہ پیدا نہیں کر سکتی جو ایمان باللہ کا عقیدہ پیدا کرتا ہے اور ایسا شخص جو محض اس بنا پر ہمدردی خلق اللہ کے خیالات پیدا کرتا ہے کبھی بھی اس شخص کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا جو اس لئے نسلِ انسانی کے ساتھ محبت اور اخوت کے تعلقات رکھتا ہے کہ بوجہ ایک خدا کی مخلوق ہونے کے یہ جذبہ اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ گویا جہاں خدا کا خیال فطری اور طبعی طور پر یہ جذبات انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے وہاں یہ دوسری قسم کے خیالات جو سوچ بچار کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں محض ضابطہ اور معاملہ کے رنگ میں انسان کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ پس فرق ظاہر ہے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دہریہ کے دل میں نسلِ انسان کی ہمدردی کے خیالات جن وجوہات سے پیدا ہوتے ہیں وہ اُسے قطعاً اس اعلیٰ اور اشرف مقام تک نہیں پہنچا سکتے جو ایمان باللہ کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ جو باقی وجوہات ہمدردی اور محبت کے خیالات پیدا کرنے کی موجب ہیں یہ عام ہیں جن سے ایک مومن باللہ بھی اسی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح کہ ایک دہریہ اُٹھاتا ہے لیکن ایمان باللہ کے نتیجہ میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ صرف مومنوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جن سے ایک دہریہ کسی صورت میں بھی متمتع نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ جہاں بہت سے اسباب کسی نتیجہ کے پیدا کرنے میں مجموعی طور پر اثر ڈالیں گے وہاں لازماً نتیجہ زیادہ اکمل اور اتم صورت میں ظاہر ہوگا۔ پس اس لحاظ سے بھی خدا کا عقیدہ بہر حال مفید اور نفع بخش ٹھہرتا ہے۔

اِس کے علاوہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اور جتنے بھی موجباتِ وحدت ہیں وہ گو ایک حد تک تعاون اور ہمدردی اور قربانی کی روح پیدا کر دیں۔ لیکن اخوتِ انسانی کا جذبہ وہ کسی صورت میں بھی پیدا نہیں کر سکتے کیونکہ اخوت کا جذبہ یعنی یہ خیال کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں سوائے اس کے اور کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا کہ انسان کے اوپر ایک واحد خالق و مالک و آقا کے وجود کو تسلیم کیا جائے کیونکہ اُخوت کے معنے ہی یہ ہیں کہ ہم سب ایک منبع سے نکلی ہوئی ہستیاں ہیں۔ لہٰذا اور اسباب خواہ کتنی بڑی حد تک بھی افراد و اقوام کے درمیان تعاون و ہمدردی کا رشتہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن ان کے نتیجہ میں اخوت کا جذبہ کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ پس اس لحاظ سے بھی ایمان باللہ کی ضرورت اور اس کا مفید ہونا ثابت ہے ظاہر ہے کہ جب تک نسلِ انسانی میں اخوت اور وحدت کا جذبہ فطری طور پر پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک ان کا ظاہری اتحاد اور تعاون اس قابل نہیں ہوتا کہ اس پر کوئی اعتماد کیا جا سکے بلکہ اس صورت میں ہر وقت اس بات کا اندیشہ رہے گا کہ جب کبھی بھی ذرا کسی کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوگی تو فوراً خود غرضی کے خیالات غالب آ کر بغض و عداوت کا رنگ پیدا کر

دیں گے۔ دنیا کا امن یقیناً اس وقت تک سخت خطرہ میں ہے جب تک کہ لوگ ایک زندہ حقیقت کے طور پر اپنے اندر یہ ایمان قائم نہ کر لیں کہ ہمارے اوپر ایک واحد خدا ہے جو ہمارا خالق و مالک ہے اور اس لئے ہم سب کو بھائی بھائی بن کر رہنا چاہیئے اور اگر کبھی ہمارے اندر اختلاف بھی پیدا ہو تو ہمیں انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے بلکہ ایک دوسرے کی خاطر قربانی اور ایثار کا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ دراصل غور سے دیکھا جائے تو ضابطہ اور معاملہ کے تعلقات محض خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں کیونکہ انسان محسوس کرتا ہے کہ اگر میں دوسروں کے ساتھ اچھے تعلقات نہ رکھونگا تو دوسرے بھی میرے ساتھ اچھی طرح پیش نہ آئیں گے اور اس طرح میرے مفاد کو نقصان پہنچے گا اور اس لئے سخود حفاظتی کے طور پر وہ حسنِ سلوک کا طریق اختیار کرتا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس لئے ہمدردی اور تعاون کا برتاؤ کرتا ہے تاکہ اُس کے نتیجہ میں لوگ بھی اس کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کا طریق اختیار کریں اور ہر چند کہ اس صورت کا نتیجہ بھی ایک حد تک مفید اور نفع بخش ہی ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک خود غرضانہ صورت کو اس اعلیٰ اور اشرف مقام سے کچھ بھی نسبت نہیں کہ جس میں ایک طبعی اور فطری جذبہ کے طور پر لوگوں کے درمیان اخوت و وحدت کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور یہ فطری جذبہ جو اخوت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے بغیر ایمان باللہ کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا (۱۸)

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک مابعد الطبیعی ہستی کے وجود یا عدم وجود کے اقرار سے انسانوں میں اتنا بڑا فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن، اگر ہم بہ نگاہ غائر اس مسئلے کا مطالعہ کریں ــ جیسا کہ ہم اس باب میں کریں گے ــ تو ہمیں محسوس ہو گا کہ اس اقرار و انکار کے بڑے اہم نتائج نکلتے ہیں۔ یہ نتائج فکری بھی ہیں اور عملی بھی، انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ اس لئے وجود باری تعالیٰ اور توحید کے مسئلے کو محض ایک علمی اور کلامی مسئلہ سمجھنا، جس کا تعلق محض فلاسفہ اور متکلمین کی موشگافیوں سے ہو، درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان و کائنات کے باہمی تعلق کے بارے میں ہر شخص کو ایک نقطۂ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ نقطۂ نظر سوچ سمجھ کر ہی اختیار کیا گیا ہو، بلکہ (جیسا کہ اکثریت کا قاعدہ ہے) بلا سوچے سمجھے بھی ایک نقطۂ نظر رکھا جا سکتا ہے اور یہ انسان اور معاشرے دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلام چونکہ افراد کی اصلاح کا آغاز بالکل بنیاد سے کرتا ہے اس لئے وہ اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ عمل صالح سے پہلے ایمان صالح پر زور دیا جائے۔ بنیاد اگر صحیح نہ ہو تو دیوار ٹیڑھی اور کمزور رہے گی اور "تا ثریا می رود دیوار کج" کا نقشہ ہوگا۔ ایسی دیوار میں اگر کچھ ظاہری حسن ہے بھی تو وہ بے کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک اعمال اگر صحیح عقائد اور صحیح نیت کے ساتھ نہ ہوں تو خدا کے یہاں بے معنی ہیں۔

ناامیدی عام ہوتی

خدا پر ایمان لانا باعث راحت نفس ہے اور گمراہوں کے لئے سبب ہدایت ہے۔ ناامیدوں کے لئے اُمید ہے اور ڈرنے والوں کے لئے اس میں امان ہے۔ اگر آدمی کا خدا پر ایمان نہ ہوتا تو زندگی بہت پریشان ہوتی اور ناامیدی عام ہوتی (رشد)

اس زمانہ میں ایمان باللہ کی حالت

سب سے پہلے میں اس جگہ اس حد درجہ قابل افسوس اور نہایت دردناک حالت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو اس زمانہ میں ایمان باللہ کے متعلق لوگوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ کہنے کو تو جتنے مذاہب بھی دنیا میں موجود ہیں وہ سب خدا کے قائل ہیں اور ان مذاہب کی طرف منسوب ہونے والے لوگ بھی باستثناء ایک نہایت قلیل تعداد کے جو ہستی باری تعالیٰ کی برملا منکر ہے خدا پر ایمان لانے کے مدعی ہیں لیکن اگر نظر غور سے دیکھا جائے اور لوگوں کی ایمانی حالت کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایمان ایک محض رسمی ایمان ہے جسے حقیقت سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔ چونکہ لوگوں کا مذہب انہیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے اور وہ اپنے باپ دادوں سے بھی یہی سُنتے چلے آئے ہیں کہ ہمارا ایک خدا ہے اور وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ قومی شیرازے کو منتشر ہونے بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ظاہری طور پر اپنے مذہب کے بنیادی اصول پر قائم رہیں اور پھر ان کے دلوں میں گاہے گاہے یہ فطری آواز بھی اُٹھتی رہتی ہے کہ ممکن ہے واقعی ہمارا کوئی خدا ہو اس لئے وہ انکار کی جرأت نہیں کرتے اور ظاہراً اسی عقیدہ پر قائم ہیں کہ اُن کا ایک خدا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے قائل نہیں اور اُن کے دل ایمان سے اُسی طرح خالی ہیں جس طرح ایک اُجڑا ہوا مکان مکین سے خالی ہوتا ہے۔

میں یہ بات کسی خاص قوم کے افراد یا کسی خاص مذہب کے متبعین کے متعلق نہیں کہتا بلکہ تمام مذاہب اور تمام دنیا کے متعلق کہتا ہوں کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ تمام مذاہب کے متبعین یعنی زرتشتی۔ بدھ۔ ہندو۔ یہودی۔ عیسائی۔ سکھ۔ مسلمان وغیرہ سب میں یہ زہر جسے بے ایمانی کا زہر کہنا چاہیئے کم و بیش سرایت کر چکا ہے اور مادیت کی گرم اور شرربار ہواؤں نے دُنیا کا کوئی چمنستانِ ایمان نہیں چھوڑا کہ اُسے جلا کر خاک نہ کر دیا ہو۔ میرے اس دعویٰ پر اگر کوئی دلیل مانگے تو میں بفضلہ تعالیٰ ایسے دلائل پیش کر سکتا ہوں جن سے کسی عقلمند غیر متعصب شخص کو انکار نہیں

ہو سکتا لیکن اس جگہ میں اس بات میں شک کرنے والوں سے صرف یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ اپنے دل کی حالت کا مطالعہ کر کے اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے حالات کو دیکھ کر دیانتداری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اِن کے ملنے والے دوسرے لوگ خدا پر واقعی ایمان رکھتے ہیں؟ ایمان سے میری مُراد رسمی سُنا سنایا ورثہ کا ایمان نہیں بلکہ زندہ حقیقی ایمان مراد ہے۔ کیا خُدا کی ہستی اُن کے لئے ایسی ہی محسوس و مشہود ہے جیسے دنیا کی مادی چیزیں اُن کے لئے محسوس و مشہود ہیں؟ یعنی کیا خدا کے متعلق وہ ایسا ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ مثلاً انہیں یہ ایمان ہے کہ یہ سورج ہے اور یہ چاند ہے اور یہ پہاڑ ہے اور یہ دریا ہے اور یہ ہمارا مکان ہے اور یہ ہمارا باپ ہے اور یہ ہمارا دوست ہے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر خوب سمجھ لو کہ یہ کوئی ایمان نہیں ہے بلکہ محض ایک شک کا مقام ہے۔ اور تم ایک مُردہ اور متعفن لاش کو زندوں کی طرح چھاتی سے لگائے بیٹھے ہو

اور اگر یہ کہو کہ یہ مرتبہ ایمان کا جو اس جگہ بیان کیا گیا ہے یہ تو انتہائی مرتبہ ایمان کا ہے جس تک پہنچنے والے بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں اور صرف خاص خاص لوگوں کو ہی یہ مقام حاصل ہوتا ہے تو میں یہ کہوں گا کہ یہ بات تمہاری ناواقفی کا ایک مزید ثبوت ہے کیونکہ ایمان کا انتہائی مرتبہ تو وہ ہے جس کی ہوا بھی ابھی تم تک نہیں پہنچی اور شاید تم میں سے اکثر لوگ اس کا نقشہ بھی اپنے ذہن میں نہیں لا سکتے اور یہ مرتبہ ایمان کا جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی خدا کے متعلق ایسا ایمان ہونا جیسا کہ اس دنیا کی مادی چیزوں کے متعلق انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایمان کے درمیانی مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔ کیا تم نے حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول نہیں پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے عام مراتب میں سے ایک مرتبہ یہ ہے کہ انسان آگ میں ڈالا جا کر خاک ہو جانا پسند کرے گا۔ مگر ایمان کو ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان کے اس مرتبہ سے اپنے آپ کو فروتر پاتے ہو تو کم از کم میرا تم سے یہ سوال ہے کہ کیا تم دیانتداری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہو کہ تمہارا ایمان ایک زندہ حقیقت کے طور پر تمہاری زندگی پر عملاً اثر انداز ہو رہا ہے۔ یعنی کیا تم اپنے دل میں واقعی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُس کی ناراضگی کا خوف محسوس کرتے ہو اور کیا تمہارا ایمان واقعی نیکی کی تحریک کرتا اور بدی سے روکتا ہے؟ اور کیا واقعی تمام اُمور میں تمہارا اصل بھروسہ خدا پر ہوتا ہے اور مادی اسباب پر نہیں ہوتا؟

میرا یہ مطلب نہیں کہ کیا تم کبھی اپنے دل میں خدا کے ساتھ وابستگی محسوس کرتے ہو یا نہیں یا کبھی اللہ تعالیٰ کا خیال تمہیں گناہ سے روکتا اور نیکی کی تحریک کرتا ہے یا نہیں یا کبھی مادی اسباب سے آگے گزر کر تمہاری نظر خدا تک پہنچتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ کبھی کبھی ایسا ہو جانا ایمان کی حالت کا نتیجہ نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ ایسی حالت اُس شخص کی بھی ہو سکتی ہے جسے صرف اس قدر بصیرت حاصل ہے کہ وہ خدا کا انکار نہیں کرتا اور گاہے گاہے اُس کی طبیعت میں یہ خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید واقعی کوئی خدا ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جو اس تمام کارخانۂ عالم کا چلانے

وہ ہے اور جس کے سامنے کسی دن میں نے کھڑا ہونا ہے۔ ایسا شخص یقیناً کبھی کبھی خدا کے اس خیالی بُت کے ساتھ ایک حد تک وابستگی محسوس کرے گا اور اس کا یہ خیال کبھی کبھی اُسے گناہ سے بھی روکے گا اور کبھی کبھی نیکی کی بھی تحریک کرے گا اور گاہے گاہے اُس کی نظر مادی اسباب سے گزر کر خدا تک بھی پہنچے گی اور وہ محسوس کرے گا کہ اصل بھروسہ کے قابل صرف خدا کی ذات ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ حالت ایمان کی حالت نہیں کہلا سکتی بلکہ دراصل ایک شک کی حالت ہے جو اس کی طبیعت میں کبھی ایک طرف کا اور کبھی دوسری طرف کا اثر پیدا کرتی رہتی ہے۔ ایمان کی حالت تبھی سمجھی جائے گی جب خدا کے متعلق ایک زندہ یقین کی صورت پیدا ہو جائے اور یہ یقین ایک مستقل جذبہ کے طور پر علیٰ وجہ البصیرت دل میں قائم ہو۔ جو انسان کی زندگی کا ایک حصہ بن جائے اور اُس کی روح کی غذا ہو جائے۔ اور اُس کے لئے ہر وقت ایک ایسی شمع ہدایت کا کام دے جو اُسے گناہ کے تاریک رستوں پر متنبہ کرتی رہے اور اُس کے ذریعہ سے نیکی کے راستے اُس کی آنکھوں کے سامنے روشن ہوتے رہیں۔ اور تمام مادی اسباب اُس کی نظر میں ہیچ ہو جائیں یعنی اُن اسباب پر اُس کا بھروسہ نہ رہے بلکہ اس کا اصل بھروسہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات پر ہو جو تمام اسباب کا پیدا کرنے والا ہے اور خدا کی محبت کی آگ اُس کے دل میں سوزاں رہے اور اُس کی ناراضگی کا خوف اس کے دل پر غالب ہو۔

اب دیانتداری کے ساتھ بتاؤ کہ کیا تم واقعی ایسا ایمان اپنے دلوں میں پاتے ہو؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اپنے آپ کو مومن کہتے ہوئے شرماؤ اور اُس ایمان کی تلاش میں لگ جاؤ جو آسمان سے اُترتا ہے۔ اور بجلی کے ایک زبردست لیمپ کی طرح دل کے دور دراز اور تاریک و تار کونوں کو منور کر دیتا ہے جس کے بعد خدا کا وجود ایک خیالی بُت نہیں رہتا جسے تمہارے دماغوں نے گھڑا ہو بلکہ وہ ایک زندہ حیّ و قیوم قدیر و عزیز مگر مشفق و مہربان بادشاہ نظر آتا ہے جس کی حکومت دیکھنے والوں کے لئے اُن حکومتوں سے بھی بہت بڑھ چڑھ کر محسوس و مشہود ہوتی ہے جو تم اِس دنیا میں دنیاوی بادشاہوں کی دیکھتے ہو۔

الغرض یہ ایک بیّن حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں حقیقی ایمان دنیا سے مفقود ہے اور نہ صرف یہ کہ عوام کے دلوں سے مفقود ہے بلکہ وہ لوگ جو مذہبی لیڈر کہلاتے ہیں اور لوگوں کو ایمان پر قائم کرنے کا دم بھرتے ہیں اُن کے دل بھی دراصل دہریت کا شکار ہو چکے ہیں۔ وہ یا تو دنیا کو دھوکہ دیتے ہیں یا خود اپنے متعلق دھوکہ خوردہ ہیں کیونکہ زبان پر تو سب کچھ ہے مگر دل میں کچھ بھی نہیں۔ یقیناً اس وقت دنیا روحانیت اور سچے ایمان کے لحاظ سے ایک خطرناک تاریکی میں گھری ہوئی ہے (مـ۸۱)

باب دوم

معرفت خدا

معرفت خدا ضروری ہے

آیات قرآن، احادیث معصومینؑ اور اقوال علماء کرام سے واضح وعیاں ہوتا ہے کہ علم و معرفت انسان کے لئے بہت ضروری ہے اور جاہل حیوان کی مثل ہے۔ حصول علم و معرفت کے لئے کافی آیات اور اَن گنت احادیث ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا اللہ کی عبادت سے مقدم اس کی معرفت ہے اور اصل معرفت خدا کو ایک ماننا ہے۔ اور توحید نفی صفات سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ ذات مستغنی ہے اس سے کہ عقل کی شہادت سے اس میں صفات حلول کر سکیں۔ کیونکہ جس میں صفات حلول کر سکتی ہیں وہ مصنوع ہوتا ہے اور خداوند عالم خالق و صانع ہے۔ نہ کہ مصنوع و مخلوق۔

سبحان اللہ کیا کلام بلاغت نظام ہے کہ جس سے معرفت الٰہی کا حاصل کرنا فرضِ ایمانی ثابت ہوا کہ عبادت فرض ہے اور وہ معرفت پر منحصر ہے تو معرفت بدرجہ اولیٰ فرض ٹھہری اور طریقۂ معرفت بھی ظاہر فرما دیا۔

- طوسی، شیخ ابوجعفر   عقائد جعفریہ ص۵ سطر ۴   مجلس المسلمین   کراچی

خداوند عالم کی معرفت ہر مکلف پر واجب ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ وہ منعم ہے لہٰذا

اس کی معرفت لازم و ضروری ہے تاکہ ہم (کما حقہ) اس کا شکر ادا کر سکیں۔

● علامہ حلی حادی عشر ص۵ سطر ۱۵ قم ترجمہ احسن العقائد ص۱۶ سطر ۲ ملتان
تمام علماء کا اجماع ہے کہ باری تعالیٰ کی معرفت اور اس کے صفات ثبوتیہ و سلبیہ و عدل باری تعالیٰ کی معرفت ضروری ہے۔

● فاضل مقداد شرح باب حادی عشر ص۶ سطر ۹ قم، احسن العقائد ص۱۶ سطر آخر ملتان
باری تعالیٰ منعم حقیقی ہے اور ہر منعم کا شکر واجب ہے۔ اس لئے کہ منعم کا شکر ادا نہ کرنے والے کی عقلاء مذمت کرتے ہیں۔ پس اللہ کا شکر واجب ہے اور شکر بغیر معرفت نہیں ہو سکتا کیونکہ شکر کو مشکور کے حال کے مطابق ہونا چاہیئے ورنہ شکر نہ رہے گا۔ پس شکر سے قبل مشکور کی معرفت ضروری ہے۔

دلیل سمعی

(۱) قول باری تعالیٰ ہے۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ تم پر اس کا علم حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔
امر چونکہ وجوب کے لئے ہے لہٰذا فَاعْلَمْ وجوب علم پر دلالت کرتا ہے۔ آیت مذکورہ سے توحید کی معرفت کا وجوب ثابت ہوا۔

(۲) جب یہ آیۂ کریمہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (آسمان و زمین کے پیدا کرنے اور رات و دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں یقیناً صاحبان عقول کے لئے نشانیاں ہیں) نازل ہوئی تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص قابل افسوس ہے جو اس آیت کو پڑھے اور اس میں غور و فکر نہ کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کی مذمت فرمائی ہے کہ جو ان اجرام سماویہ و ارضیہ جن کا ذکر آیت میں ضمناً فرما دیا گیا ہے ان اجسام کے ذریعہ ان کے صانع کے وجود اور اس کے علم قدرت پر استدلال نہ لائے کیونکہ یہ اجرام سماویہ و ارضیہ اپنے صانع کے وجود و علم و قدرت پر دلالت کرتے ہیں۔ پس ان اجرام سماویہ و ارضیہ کے ذریعہ باری تعالیٰ کے وجود اور اس کے صفات پر دلیل لانا واجب ہوا اور یہی ہمارا مقصد ہے۔

● تھانوی، اشرف علی اسلام اور عقلیات ص۱۶۵ سطر آخر اشرفیہ لاہور
یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم خدا کے قائل ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ کوئی قید اور بھی ہے جس کے بغیر مذہب

میں امتیاز نہیں ہو سکتا ۔ اور سوا اس کے کوئی معیار نہیں جس سے پہچان سکیں کہ اب ہم نے مذہب حق کو اختیار کیا وہ قید یہ ہے کہ خدا کو اسی طرح پہچاننا ضروری ہے جس طرح کہ واقع میں ہے ۔ جس سے اس کی خدائی سچے معنوں میں خدائی کہلائی جا سکے ۔

● آل کاشف الغطاء شیخ محمد حسین دین و اسلام صہ۱۵ سطر ۱۲ لاہور

ہر قوت ادراک و شعور رکھنے والا جب اپنے اوپر ظاہری و باطنی نعمتوں کی غیر متناہی کثرت پر نگاہ کرتا ہے تو فوراً اس کی توجہ اس امر کی طرف مبذول ہو ہی جاتی ہے کہ ان نعمتوں کے لئے کوئی سبب ضرور ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ ان نعمتوں کا موجد نہ تو میں خود ہوں اور نہ مجھ جیسا کوئی انسان ہے ۔ اور فطرت نفس انسانی کا تقاضا ہے کہ جس چیز کو نہ جانتا ہو اُسے جاننے کی کوشش کرے ۔ لہٰذا اپنے منعم کے ڈھونڈنے کے لئے اس کے افکار تحریک میں آ جاتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ احتمال بھی جگہ لے لیتا ہے کہ محسن منعم کی معرفت سے غفلت کا نتیجہ کہیں یہ نہ ہو کہ عطا شدہ تمام نعمات مجھ سے سلب کر لی جائیں اور من جملہ تمام دوسری نعمات کے نعمت وجود بھی ہے اس کا سلب موت ہے ۔ پس اس احتمال ضرر سے بچنے کی خاطر عقل کے نزدیک منعم کی معرفت میں نظر و فکر کو عمل میں لانا واجب اور ضروری ہے ۔ یا یوں سمجھئے کہ نعمات پر توجہ کرنے کے بعد یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ان کی بقا شکر سے وابستہ ہو اور شکر بغیر معرفت کے ہو نہیں سکتا لہٰذا دوام و بقائے نعمات کے لئے معرفت منعم ضروری ہے کیونکہ عقل کی شریعت میں ضرر محتمل کا دفع کرنا واجب ہوا کرتا ہے ۔

دین کی ابتدا معرفت خدا

حضرت علیؑ نے فرمایا کہ دین کی ابتداء اس کی معرفت ہے ۔ کمال معرفت اس کی تصدیق ہے کمال تصدیق توحید ہے ۔ کمال توحید تنزیہہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے ۔
(نہج البلاغہ خطبہ ۱ صہ۷ سطر ۱۹ ۔ لاہور)

وجوب نظر و فکر

تغیر و تبدل کی نیرنگیوں سے محفوظ اور انقلاب زمانہ سے نہ بدلنے والی فطرتِ انسانیہ و جبلت بشریہ

کے تقاضوں میں سے اولی اور بدیہی تقاضا یہی ہے کہ زندہ وحساس انسان فارغ البالی ، سادہ خیالی اور آرام دہ زندگی میں کچھ ایام بسر کرنے کے بعد جب حیوانیت کے جاہلانہ طور سے انسانیت کے عرفانی دور کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اس کی غور و فکر کا پہلا قدم اور اس طبعی نیند سے آنکھ کھلنے کے میدان بحث و نظر میں اس کی پہلی حرکت اور اس جہالت کی موت کے بعد اس تازہ زندگی کی پہلی روح جو اس میں نفوذ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مادہ و طبیعت میں محسوس ہونے والے تغیرات و تصورات کے علل واسباب کیا ہیں؟ خصوصاً وہ اچانک واقع ہونے والے حوادث جو کبھی کبھی مشاعر کے سامنے رونما ہوتے ہیں اور طبیعتیں ان سے چنداں مانوس نہیں ہوتیں اور ان سا ذو نادر مشاہدہ طبیعتوں کو استعجاب میں ڈال دیتا ہے مثلاً دمدار ستاروں میں ظہور جس قدر تعجب انگیز ہوتا ہے طلوع شمس و قمر میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی ، کسوف و خسوف سے جو گھبراہٹ اور دہشت طاری ہوتی ہے وہ روزمرہ کے سورج کے غروب اور ماہانہ چاند کی محاق سے نہیں ہوتی ۔ حالانکہ مال سب کا ایک ہے لیکن اسباب و مبادی میں فرق ہے ۔

بہرکیف فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ ورطۂ عدم سے منصۂ مشہود پر آنے والی ہر چیز کے سبب کی طرف ذہن و دماغ متوجہ ہو ۔

لیکن یہ ذہنی توجہ اور دماغی حرکت دو صورتوں سے رونما ہوتی ہے ۔

ایک وہ جو آنی ہو یعنے ذہن متوجہ ہونے کے بعد پھر غفلت کی نیند سو جائے ۔ گویا بجلی کی چمک کی طرح ظاہر ہو کر فوراً ختم ہو جائے تو اس کا نتیجہ بس یہی ہے کہ بوڑھاپے کے دور تک انسان اُسی بچپنے کی سی غفلت کے بحر میں غرقاب ہی رہتا ہے اور مادیات کے بارہا کے تجربہ سے صرف اسی رُوحِ مجرد کی خدمت کرنا ہی جانتا ہے جو اس فانی اور کثیف بدن کی اصلاح و بہبود کا کفیل ہے (یعنی صرف خورد و نوش اور سیر و تفریح اور بہیمانہ زندگی کے لئے اسباب راحت و آرام اور ذرائع عیش و عشرت کی تحصیل میں مصروف رہنا ہی اُس کا مآل زندگی ہوتا ہے)

دوسری وہ جو آنی نہ ہو بلکہ دائمی اور مستمر ہو ۔ اس قسم کی ذہنی توجہ فکر کو کائنات میں ہونے والی چیزوں کے اسباب کی تلاش پر متحرک کرتی رہتی ہے ۔ ایک سبب کے بعد دوسرے کی تلاش اس کے بعد تیسرے کی ۔ اور یہ سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا اور جب تک یہ روحِ انسانی اس ہیکل عنصری میں بند اور قفس مادہ میں قید ہے فکر و نظر کی غور و خوض اور کد و کاوش حقیقت کے تعاقب میں لگاتار لگی رہتی ہے ۔

اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ طبیعت سلیمہ ، فطرت صحیحہ ، عقل مستقیم اور نظر صادق رکھنے والوں کے افکار جو کجروی کے عیب سے پاک و صاف ہوں ۔ طبیعت کی تحریک اور فطرت

کی نیابت میں اپنی ذاتی قابلیت اور اسباب و ذرائع کے لحاظ سے غور و خوض کی بلندیوں اور معرفت کی چوٹیوں کو سر کر لیتے ہیں اور لا محالہ ایک ایسے انجام تک پہنچتے ہیں جہاں سے ممکنات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور جہاں اسباب و علل کا سلسلہ ختم ہوا۔ جو ہر چیز کا مبداء ہے اور اس کا مبداء کوئی نہیں۔

اس مقام پر لوگوں کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں:۔

(۱) ایک قسم تو ایسے لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ ہم نہ یہ باتیں جانتے ہیں اور نہ اِن تاریک گڑھوں اور مشکل جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ بس زندگی کے چار دن اچھے گذر جائیں اور کھانا پینا خوشحالی کا ہو۔ اس سے آگے نہ کچھ جانتے ہیں اور نہ جاننا چاہتے ہیں تو گویا ان لوگوں نے جہالت میں رہ کر چراغ عقل کو خاموش کرتے ہوئے حیوانیت کی زندگی پر آنکھیں بند کر لیں اور آسودہ ہو گئے۔

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے جہالت کی تاریکیوں میں پڑے رہنے کو درجِ انسانیت کے لئے زہر قاتل قرار دیا لہٰذا وہ آگے بڑھے اور افکار و اذہان کی پشت پر سوار ہو کر انہوں نے تلاش حقیقت میں جولان کیا اور کافی دوڑ دھوپ کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے کہ تمام مبادی کا مبداء اول اور تمام غایات کی غایت القصویٰ ایک محسوس چیز ہے جو خود ہر شعور و ادراک سے خالی ہے اور اس تجویز کردہ مبداء اول کے ناموں میں پھر انہیں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا۔ طبیعت ہے اور کسی نے مادہ کہا اسی طرح اثیر۔ ہیولیٰ۔ دھر۔ جوہر۔ زمانہ۔ قوت و فعل وغیرہ اپنی اپنی پسند کے نام پر جماعت نے تجویز کر لئے اور تمام کائنات کا ماں باپ بس صرف اسی ایک معنے کو قرار دے دیا۔

(۳) اور تیسری قسم وہ ہے جو اس نقطۂ نظر تک پہنچے کہ طبیعت و مادہ کے مابعد تمام اشیاء کا مبداء المبادی ایک اور ذات ہے جو سب سے اول ہے اور اس کے اوّل کوئی چیز نہیں۔ دوسری اور تیسری قسم کے لوگ گویا ایک حد تک ایک دوسرے کے ساتھ ہیں یعنے اسباب و علل پر نگاہ کرنا اور جہالت سے گریز کئے ہوئے نور معارف تک رسائی حاصل کرنا دونوں واجب سمجھتے ہیں اور اس سلسلہ میں فکر و نظر کی کافی منازل اور غور و خوض کے بہت سے مراحل پل چل کر ایک ہی مقصد تک پہنچے۔ اور جب ایک سبب اور مبداء سے دوسرے اور اُس سے تیسرے چوتھے تک پہنچتے ہوئے علیٰ ھذا القیاس جب اس نوبت تک پہنچے جس کو ہیولیٰ یا طبیعت یا دھر وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ تو وہ (دوسری قسم والے) ہمت ہار گئے اور کہہ دیا کہ بس یہی مبداء ہے جس کو ہم تلاش کر رہے تھے لیکن صاحبانِ ہمت اور آگے بڑھے اور یہ سمجھ لیا کہ ہمارے منازل سیر اور مراحل سفر میں سے یہ بھی ایک منزل اور مرحلہ ہے اور غایت اور مقصود اس سے آگے ہے جسے مبداء اوّل کہنا چاہیئے۔

بہرکیف میرا مقصد صرف اس مقام پر یہی بیان کرنا تھا کہ انسان کی آنکھوں سے غفلت کی نیند یا جہالت

کی پٹی کھلتے ہی جو چیز فطری طور پر پہلے پہل اُس کے ذہن و دماغ میں خطور کرتی ہے اور جس کی طرف اس ہوشیاری کے بعد پہلا قدم رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام ہونے والی اور تغیر و انقلاب پسند اشیاء کے علل و اسباب کی تلاش اس کا مطمع نظر ہوتا ہے اور یہ نظر و فکر انسان کا پہلا فطری و عقلی فریضہ ہے اور علماء کا یہ فرمان کہ معرفت لازم اور فکر و نظر واجب ہے اس سے مراد یہی نفوس و طبائع انسانیہ کا فطری عہدہ اور طبعی عندیہ ہے۔ (۴۲)

تفکر فی المخلوقات کا حکم

اسی سبب سے سیدنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک میں غور و فکر سے منع فرمایا ہے (کیونکہ عقل محدود میں غیر محدود ذات کا ادراک ناممکن اور محال ہے اور فرمایا کہ **تفکروا فی الاءِ اللہِ** اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے لئے تمام نشانیاں زمین میں موجود ہیں انہیں نشانیوں سے اللہ تعالیٰ کو پہچاننا چاہیئے۔

کسی بدوی سے کسی نے دریافت کیا کہ تو خدا کو کیسے پہچانتا ہے اس دیہاتی عرب نے جواب دیا کہ:

البعرۃ تدل علی البعیر — واثارۃ الاقدام علی المسیر

فسماءٌ ذات ابراج وارضٌ ذات فجاج — کیف لا تدل علی اللطیف الخبیر

جس طرح اونٹ کی مینگنیاں گواہی دیتی ہیں کہ اس راہ سے اونٹ گزرا ہے اور قدموں کے نشانات چلے ہوئے راستوں کا پتہ بتاتے ہیں پس آسمان برجوں والا اور زمین کشادہ راستوں والی اس ذات پاک لطیف و خبیر کے وجود پاک پر کیونکر دلالت نہ کریں گے کسی نے خوب کہا ہے۔

کہے دیتی ہے شوخی نقش پاکی — ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

ایک بدوی کا اور قصہ یاد پڑا جس وقت اس بدوی نے یہ آیت سُنی۔

فورب السماء والارض انہ	تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی
لحق مثل ما انکم تنطقون ۝	کہ وہ روز جزاء برحق ہے اور ایسا یقینی ہے جیسا
(سورہ ذاریٰت)	تم باتیں کر رہے ہو اور کبھی اس میں شک نہیں ہوتا

اسی طرح اس کو یقینی سمجھو (بیان القرآن پ ۲۶ ذاریٰت)

پس اس آیت کو سنتے ہی اس بدوی نے چیخ ماری اور غلبہ حال میں کہا وہ کون ظالم تھا جس نے میرے رب سے ایسی قسم کھلائی (۱/۲/۷)

اقسام معرفت توحید

میں کہتا ہوں یہی معاملہ معرفت توحید الٰہی میں ہے پہلے معرفت مستولی ہے جو ہر ذی شعور کو معائنہ حالات انفس و انفاق سے بداہتہً حاصل ہوتی ہے اور تمام عالم پر اُس کا استیلا ہے اُس میں بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔

دوسری معرفت دلیلی ہے جو دلالت آیات و احادیث اور قواعد علوم معقول و منقول سے اہل علم غور و خوض و بحث و نظر سے حاصل کر سکتے ہیں اور ان کے مباحث کے مجموعہ کا نام علمِ کلام ہے یہ توحید شریعت یا بتاویل توحید حکمت کہہ سکتے ہیں۔

تیسری معرفت سری ہے جو بطور اسرار انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر منکشف ہوتی رہتی ہے اور ان کا سینہ گنجینہ اسرار ہو کر معارف الٰہیہ کا آئینہ دار بن جاتا ہے اور مبدء فیاض سے ہر وقت بقدرِ ظرف سالک قلب پر فیضان علم و حکمت حقیقی کی بارش ہوا کرتی ہے۔ تو معرفت مستولی تمام بندگانِ خدا میں مشترک عام اور معرفت دلیلی علماء و حکماء کے لئے خاص ہے۔ اور معرفت سری صرف صاحبان اسرار کا حصہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پس جو ان ہر سہ معارف میں سے جسقدر حاصل کرے گا اسی قدر وہ فیض توحید باری تعالیٰ شانہ سے شاد کام و فائز المرام ہوگا جس بدقسمت کو ان میں سے کوئی سی بھی معرفت حاصل نہ ہوگی۔ اس کے تمام اعمال ضائع اور خود ناکام و تہی دست رہے گا۔ (۲/۴۱)

معرفت خدا عقلاً واجب ہے

اہل سنت کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت سمعی طور پر واجب ہے نہ کہ عقلی طور پر (المواقف جلد ا ص ۲۵۱ السعادۃ مصر) ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت عقلاً واجب ہے نہ کہ سمعاً۔ یعنی عقل انسان پر واجب قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے۔ کیونکہ واجب ہونے کی پہچان واجب کرنے والے کی پہچان پر موقوف ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے ہم عقل کے ذریعے خدا کو پہچانیں۔ پھر ان چیزوں میں غور و فکر کریں جو اس نے واجب کی ہیں۔ اور جو واجب نہیں کیں اور یہ محال ہے کہ ہم اس کے احکام کو پہچانیں جبکہ خود اس کو نہیں پہچانتے۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو اس سلسلہ میں سمعی (شرعی) طور پر آئی ہیں مثلاً خدا کا یہ ارشاد کہ فاعلموا

ان لا الہ الاّ ھو" علم پیدا کرو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں تو یہ حکم عقل۔ بیان اور تقریر ہے۔ نہ کہ تاسیس جدید ہے شارع کی طرف سے۔ (بارہ امامی شیعہ ص۳۴ سطر ۵)

معرفت خدا بدلیل واجب ہے

دلیل کے معنی لغت میں مرشد و رہنما کے ہیں اور اصطلاح میں دلیل اس شئے کو کہتے ہیں جس کے علم سے دوسری شئے کا علم لازم آئے۔

معرفت توحید کا وجوب ثابت ہو جانے کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ معرفت دلیل و برہان کے ذریعہ ہو۔ کیونکہ معرفت و علم کی دو قسمیں ہیں بدیہی و نظری۔

علم بدیہی:۔ وہ ہے کہ جس کا حصول دلیل و برہان پر موقوف نہ ہو اور عقلاء اس میں اختلاف نہ رکھتے ہوں بلکہ ادنیٰ توجہ نفس یا حواس خمسہ کے ذریعے اس کا حصول ہو جائے۔

علم نظری:۔ وہ ہے جس کا حصول دلیل و برھان پر موقوف ہو۔ عقلاء کا اس میں اختلاف ہو۔ ادنیٰ توجہ نفس و حواس خمسہ کے ذریعہ اس کا حصول نہ ہو۔

— علم بدیہی کی مثالیں:۔ آگ گرم ہے۔ سورج روشن ہے۔ ایک دو کا نصف۔ ہم کو خوف و غضب لاحق ہوتا ہے۔ ہم میں قوت و ضعف پیدا ہوتا ہے۔ وغیرہ

— علم نظری کی مثالیں:۔ عالم حادث ہے۔ صانع عالم واحد ہے۔ شریک باری تعالیٰ کا وجود محال ہے۔ واجب تعالیٰ کا جسم نہیں ہے وغیرہ

معرفت توحید چونکہ بدیہی نہیں ہے اس لئے کہ اس میں عقلاء کا اختلاف موجود ہے۔ یہ معرفت بدیہی نہ ہوئی تو نظری ہوئی۔ کیونکہ علم کی دو ہی قسمیں ہیں۔ علم کی کوئی تیسری قسم بدیہی و نظری کے علاوہ نہیں ہے۔ علم نظری بغیر دلیل و برھان حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے معرفت توحید حاصل کرنے کے لئے دلیل و برھان واجب ہوا۔

اگر دلیل و برھان کو واجب قرار نہ دیا جائے گا۔ تو دو خرابیوں میں سے ایک خرابی لازم آئے گی۔ یا واجب مطلق۔ مطلق نہ رہے گا۔ یا تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی۔ اور یہ دونوں امر باطل ہیں۔

مذکورہ دو خرابیوں میں سے کسی ایک خرابی کے لازم آنے کی وجہ یہ ہے کہ دلیل و برہان کے واجب نہ ہونے کی صورت میں یا اصول دین کی معرفت واجب نہ رہے گی۔ یا واجب رہے گی۔ اگر واجب

نہ رہے گی تو لازم آئے گا کہ واجب مطلق واجب مطلق نہ رہے - اور اگر واجب رہے گی تو تکلیف مالایطاق لازم آئے گی - اس لئے کہ بغیر دلیل و برہان معرفت توحید محال ہے۔

معرفت خدا تقلید نہیں

معنیٔ تقلید: غیر کا قول بغیر دلیل تسلیم کر لینا تقلید کہلاتا ہے - توحید کی معرفت بذریعہ تقلید جائز نہ ہونے پر دو دلیلیں ہیں۔

(۱) اگر علماء علم میں مساوی ہوں اور ان کے اعتقادات میں اختلاف ہو - تو اس صورت میں مقلد یا تمام علماء کی تقلید کرے گا یا بعض علماء کی - اگر تمام علماء کی تقلید کرے گا تو متضاد عقائد کا اجتماع لازم آئیگا جو کہ باطل ہے - اور اگر بعض علماء کی تقلید کرے گا تو یہ تقلید کسی مرجح کی وجہ سے ہوگی - یا بغیر کسی مرجح کے ہوگی - اگر کسی مرجح کی وجہ سے ہے تو تقلید نہیں ہے - کیونکہ مرجح ہی اس مقام پر دلیل ہے - اور اگر بغیر کسی مرجح کے ہے تو ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی جو کہ محال ہے - پس ثابت ہوا کہ معرفت توحید بذریعہ تقلید جائز نہیں۔

(۲) جب مشرکین مکہ سے یہ کہا گیا کہ وہ ایک خدا کو مانیں تو انہوں نے آباؤ و اجداد کی تقلید سے انحراف سے انکار کیا اور انہوں نے کہا کہ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ - ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک مذہب پر پایا - ہم تو انہی کے پیرو رہیں گے۔

خدا عقل سے بالاتر ہے

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے - اس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ صانع عالم کی اس قدر اجمالی معرفت بدیہی و فطری ہے - کہ اس عالم کا ایک قادر و علیم صانع اور خالق حکیم موجود ہے - جس سے بعونہ تعالےٰ بطریق احسن و اکمل ہم عہدہ برآ ہو چکے ہیں - (والحمد للہ علےٰ احسانہ) لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے - کہ اس ذاتِ ذوالجلال کی کُنہ حقیقت تک رسائی حاصل کرے - تو "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔

یہ وہ مشکل مرحلہ ہے - کہ یہاں انبیاء عظام و اولیاء کرام بھی بارگاہِ قدس میں اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے یوں عرض کرتے ہیں - سُبْحَانَکَ مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ - حق بھی یہی ہے - کہ حریمِ ذات

تک ہمارے عقول و اوہام کی رسائی ناممکن و محال ہے۔ اور خالقِ عالم کی کنہِ حقیقت کی معرفت ممتنع ہے۔ ابن التراب و رب الارباب۔ یعنی چہ نسبت خاک را عالمِ پاک۔ اس سلسلہ میں خود ارشاد قدرت ہے۔ وَلَا یُحِیطُونَ بِہٖ عِلْمًا۔ کہ لوگ خداوند عالم کی ذات کا احاطۂ علم نہیں کر سکتے۔ ادعیہ مبارکہ میں وارد ہے۔ سُبْحَانَ مَنْ لَا یَعْلَمُ مَا ھُوَ اِلَّا ھُوَ پاک ہے وہ ذات جس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔

سید الانبیاء والمرسلینؐ فرماتے ہیں۔ ان اللہ احتجب عن العقول کما احتجب عن الابصار وان الملأ الاعلیٰ یطلبونہٗ کما تطلبونہٗ انکم۔ خداوند عالم کی حقیقت عقول و افہام کی دسترس سے اسی طرح بلند و بالا اور ان سے مخفی و مستور ہے جس طرح آنکھوں کی رسائی سے بالا ہے۔ اور عالمِ بالا کی مخلوق اسے اسی طرح تلاش کرتی ہے جس طرح تم اُسے تلاش کرتے ہو۔ (ہدایت الموحدین)

سید الموحدین حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔ الحمد للہ الذی لا یبلغ مدحتہ القائلون ولا یحصی نعمائہ العادون ولا یؤدی حقہ المجتہدون الذی لا یدرکہ بعد الہمم ولا ینالہ غوص الفطن الذی لیس لصفتہ حد محدود ولا نعت موجود ولا وقت معدود ولا اجل ممدود الخ (نہج البلاغۃ) سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں۔ جس کی مدح و ثنا تک بولنے والے نہیں پہنچ سکتے۔ اور نہ شمار کرنے والے اس کی نعمتوں کو گن سکتے ہیں۔ اور نہ کوشش کرنے والے اس کے حقوق ادا کر سکتے ہیں۔ اسے بلند ہمتیں درک نہیں کر سکتیں۔ اور نہ ہی عقل و دریکی گہرائیاں اس کی کنہِ حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کی کوئی حد مقرر نہیں نہ اس کی تعریف کے لئے لفظ موجود ہیں۔ نہ اس کی ابتداء کے لئے کوئی وقت اور اس کی انتہا کے لئے کوئی مدت ہے۔

اسی طرح حضرت امام زین العابدینؑ صحیفہ سجادیہ کی پہلی دعائے تحمید میں فرماتے ہیں۔ الحمد للہ الاول بلا اول کان قبلہ والآخر بلا آخر یکون بعدہٗ الذی قصرت عن رؤیتہ ابصار الناظرین وعجزت عن نعتہ اوہام الواصفین۔ الخ۔ سب حمد و ثنا اس خدا اجل علا کے لئے ہے۔ جو ایسا اوّل ہے۔ کہ اس سے پہلے کوئی اوّل نہیں۔ اور ایسا آخر ہے۔ کہ اس کے بعد اور کوئی آخر نہیں۔ وہ اتنا اجل و ارفع ہے۔ کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر اور وصف کرنے والوں کے عقول و اوہام اس کی تعریف و توصیف سے عاجز ہیں۔ نیز آنجناب دعائے دو شنبہ میں فرماتے ہیں کلت الالسن عن غایۃ صفتہ والعقول عن کنہ معرفتہ ..... زبانیں اس کی انتہائی توصیف کرنے سے عاجز اور عقلیں اس کی حقیقی معرفت تک رسائی حاصل کرنے سے

درماندہ ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ان کل ما تصورہ احد فی عقلہ اووھمہ اوخیالہ فاللہ سبحانہ غیرہ وورائہ لانہ مخلوق والمخلوق لایکون من صفات الخالق (شرح اصول کافی) جو شخص اپنے عقل یا وہم یا خیال میں خدا کی ذات کا کوئی خیالی تصور قائم کرے۔ اسے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ خدا اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ کیونکہ جو کچھ اس کے ذہن میں آجائے وہ اس کے ذہن کی مخلوق ہے۔ مگر خدا خالق ہے۔ مخلوق نہیں ہے۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کیف اصفہ بالکیف وھو الذی کیف الکیف حتی صار کیف فعرفت الکیف بما کیف لنا الکیف۔ خلاصہ یہ کہ بھلا میں خداوند عالم کی کیفیت وچگونگی کے ساتھ کس طرح توصیف کر سکتا ہوں۔ حالانکہ خدا نے ہی کیفیت کو پیدا کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کیفیت بن گئی۔ اور اسی کے بتلانے سے ہم نے کیفیت کو پہچانا۔ لہٰذا خالق اپنی مخلوق کے ساتھ کیونکر متصف ہو سکتا ہے؟ اسی بنا پر حضرت امیر المومنینؑ فرمایا کرتے تھے۔ لاتقدر عظمۃ اللہ علی قدر عقلک فتکون من الھالکین۔ خدائے قدوس کی عظمت وجلالت کا اندازہ اپنی ناقص عقل سے نہ لگاؤ ورنہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ چونکہ حقیقتِ خداوندی تک رسائی حاصل کرنا لوگوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ بلکہ اس کی ذات میں غور وخوض کرنے سے ضلالت وگمراہی کا شدید خطرہ تھا۔ اسی لئے پیشوایانِ دین نے اس سلسلہ میں مزید غور وخوض کرنے کی ممانعت فرمائی۔ چنانچہ اس مضمون کی متعدد روایات اصولِ کافی میں موجود ہیں۔ لاتکلموا فی خلق اللہ فان الکلام فی اللہ لایزداد صاحبہ الا تحیراً۔ (فرمان امام محمد باقر علیہ السلام) نیز انہی بزرگوار سے مروی ہے۔ فرمایا۔ ایاکم والتفکر فی اللہ ولکن اذا اردتم ان تنظروا الی عظمۃ اللہ فانظروا الی عظیم خلقہ۔ اللہ سبحانہ کی کنہ ذات میں غور وفکر نہ کرنا۔ ہاں جب تم اس کی عظمت وجلالت دیکھنا چاہو۔ تو اس کی مخلوق کی عظمت میں غور وتامل کر لینا۔

اس طرح حضرت صادقؑ سے منقول ہے۔ فرمایا۔ تکلموا فی کل شئی ولا تتکلموا فی ذات اللہ ہر شئے میں گفتگو کرو۔ مگر خداوند عالم کی ذات کے بارے میں کلام نہ کرو۔ نیز انہی حضرت سے یہ بھی مروی ہے۔ من نظر فی اللہ کیف ھو ھلک۔ جو شخص اللہ سبحانہ کی کیفیت میں غور وفکر کرے گا۔ وہ ہلاک ہو جائے گا۔ آیت مبارکہ ان الی ربک المنتھی کی تفسیر میں حضرت صادق آل محمدؐ سے مروی ہے۔ اذا انتھی الکلام الی اللہ فامسکوا۔ جب سلسلۂ کلام خدائے رحمٰن تک پہنچ جائے۔ تب فوراً

خاموش ہو جاؤ۔ خلاصہ یہ کہ خالقِ کائنات کے متعلق یہی اجمالی عقیدہ کافی ہے۔ کہ وہ واجب الوجود اس کائنات کا خالق اور ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے منزہ ومبرا اور ذات وصفات میں بے مثل و بے مثال ہے۔ بس کمثلہ شئی سورہ توحید کے مطالب پر ایمان رکھنا کافی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ قل ھو اللہ احد۔ اللہ الصمد۔ لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد۔ اے میرے حبیب کہہ دو اللہ ایک ہے۔ وہ تمام عالم سے بے نیاز ہے۔ اس سے کوئی پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر و نظیر ہے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا۔ من قراء قل ھو اللہ احد وامن بھا فقد عرف التوحید۔ جو شخص سورۂ قل ہو اللہ کو سمجھ کر پڑھے۔ اور اس پر ایمان لائے۔ اس نے توحید کی معرفت حاصل کر لی۔ اور حضرت امام زین العابدینؑ سے منقول ہے۔ فرمایا ان اللہ عزوجل علم انہ یکون فی اخر الزمان اقوام متعمقون فانزل اللہ تبارک وتعالیٰ قل ھو اللہ احد والایات من سورۃ الحدید الی قولہ علیم بذات الصدور فمن رام وراء ذلک فقد ھلک۔ خداوند عالم کو علم تھا۔ کہ آخری زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو (مباحث توحید میں) بہت غور و تعمق سے کام لیں گے۔ اس لئے اس نے سورۂ توحید اور سورۂ حدید کی پہلی چند آئتیں علیم بذات الصدور تک نازل کر دیں۔ لہٰذا اب جو شخص اس سے مزید حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہلاک ہو جائے گا۔ اس مطلب کی ابن ابی الحدید معتزلی نے بہت صحیح تصویر کشی کی ہے ؏

فیک یا اعجوبۃ الکون غدا الفکر کلیلا ٭ انت حیرت ذوی اللب وبلبلت العقولا
کلما اقدم فکری فیک شبراً فر میلاً ٭ ناکصاً یخبط فی عمیاء لا یھتدی سبیلاً

اے عجوبۂ کائنات تیرے متعلق عقل و فکر درماندہ ہو گئے ہیں۔ تو نے صاحبان عقل کو متحیر اور عقول وافہام کو پریشان کر دیا ہے جب بھی اپنے جولانِ فکر کو مہمیز کر کے تیرے بارہ میں ایک بالشت آگے بڑھاتا ہوں۔ تو وہ پچھلے پاؤں اندھا دھند ایک میل ہٹ جاتا ہے اور کوئی راستہ نہیں پاتا۔ سعدی نے بھی اس مطلب کو اپنے مخصوص انداز میں یوں ادا کیا ہے ؏

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ——— وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ——— ما ہمچناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

عقلاً بھی یہ بات مسلم ہے۔ کہ کسی چیز کی حقیقی معرفت اس وقت ہو سکتی ہے۔ کہ جب اس کی جنس و فصل کی معرفت ہو۔ اور جس ذات والا صفات کی کوئی جنس وفصل ہی نہ ہو۔ تو پھر بھلا اس کی حقیقی معرفت کیونکر حاصل

ہو سکتی ہے ۔ بہر حال ہم شکار معرفتِ کردگار کے صیادوں کو یہ مشورہ دے کر اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں وقتِ عزیز ضائع نہ کریں

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں　　کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را　(۲)

یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے۔ اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ایک محدود (FINITE) ذہن، لامحدود (INFINITE) کا تصور کر ہی نہیں سکتا خدا تو بہت بڑی چیز ہے۔ دورِ حاضر کے مفکرین اور سائنسدان ہمیں بتلاتے ہیں کہ زمان (TIME) کی کوئی ابتدا نہیں اور مکان (SPACE) کی کوئی انتہا نہیں۔ یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ زمانہ فلاں وقت سے شروع ہوا اور کائنات کی فضا کا آخری کنارہ وہ ہے۔ نہ زمانہ کا کہیں سے آغاز ہوا۔ نہ فضا کا کوئی آخری کنارہ ہے۔ فلسفہ اور سائنس ہمیں یہ بتلاتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے ذہن پر زور ڈالئے اور ایک لاابتدا، زمان یا لاانتہا مکان کا تصور قائم کرنے کی کوشش کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ذہن میں ان کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ آپ جتنا زیادہ زور ذہن پر ڈالیں گے اتنی ہی جلدی آپ جھنجھلا اُٹھیں گے۔ سو جب زمان اور مکان کے تصور کی یہ حالت ہے تو خدا کی ذات کا تصور (جو زمان و مکان کا خالق ہے) کس طرح انسان کے حیطۂ ادراک میں آ سکتا ہے۔

انسان کے ضعیف دل و دماغ کی اس سے زیادہ جسارت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی اس عقل خام اور ناتمام کے ذریعے خداوندِ عالم کی ذات کو محسوس کرنا چاہتا ہے ۔ اور جب عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تو صاف خدا کا انکار کر دیتا ہے، خدا کی ہستی کا یہ منکر یہ نہیں دیکھتا کہ ابھی انسان کے علم و عقل کی رسائی کہاں تک ہوئی ہے اور عقل کی رسائی کی حد کس جگہ جاکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور میں جو کچھ علوم و فنون کی ترقی ہوئی ہے وہ بے حد قابلِ فخر ہے، اور انسان اس پر جس قدر ناز کرے کم ہے، زمین نے اپنے دفینے ظاہر کر دیئے سمندر نے اپنے خزانے کھول دیئے، طبقۂ ہوا انسانی عقل سے پائمال ہوتا جا رہا ہے، اور آج ہم کو ہوا پر بھی اسی طرح قدرت حاصل ہے جس طرح پانی پر، آب و نار سب ہمارے قبضے میں ہیں، برق و باد پر ہماری حکمرانی ہو رہی ہے، ان تمام ترقیات کو دیکھ کر یہ کہنے میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کہ انسان کی عقل تحت الثریٰ سے اوجِ ثریا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔

یہ سب کچھ سہی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری عقلوں کی ترقی ختم ہو گئی، اور تمام علوم و فنون ہمارے قبضے میں آ گئے، اور اب اس کے آگے ترقی کی کوئی حد نہیں ہے، یہ خیال قطعاً غلط ہے، ابھی ہماری عقلیں بالکل

ہی پست ہیں، آج اس قدر عقلی ترقی کے باوجود ہماری عقلوں کو اشیاء عالم کی ماہیت معلوم نہ ہو سکی، حقائق فطرت کے متعلق ہماری معلومات قطعاً ناقص ہیں سینکڑوں چیزیں ایسی ہیں جن سے ہم کام لے رہے ہیں لیکن ان کی حقیقت سے ترقی یافتہ عقلیں بھی اسی قدر جاہل ہیں جس طرح ایک وحشی کی عقل جاہل ہے، آج الکٹری یا بجلی سے ہزاروں کام لئے جا رہے ہیں گویا کہ موجودہ مدنیت اور حضارت کی بنیاد اسی پر قائم ہے لیکن ہزاروں موشگافیوں اور کاوشوں کے بعد بھی انسانی عقل اب تک اس کی صحیح اور قطعی حقیقت سے واقف نہ ہو سکی۔

جب مشاہدات عالم اور مادیات میں ہماری عقلوں کا یہ حال ہے تو پھر ایسی کمزور عقل سے خدا کی حقیقت کو معلوم اور محسوس کرنا کس قدر مشکل امر ہوگا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ چند دن قبل عقل نے کسی مسئلہ کو بالکل صحیح اور یقینی قرار دیا تھا، لیکن آج وہی عقل اس کو غلط ثابت کر رہی ہے، کل جو چیز ناممکن اور محال سمجھی جاتی تھی۔ آج وہی چیز ممکن اور خارج میں واقع ہو رہی ہے، بڑے بڑے ہمعصر سائنس دان اور فلسفی اکثر باتوں میں باہم مخالف نظر آ رہے ہیں، ایسی حالت میں اگر ہم خدا کو سمجھ نہ سکیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے، جس عقل سے خدا کی ہستی کا انکار کیا جاتا ہے وہ خود ہی متزلزل اور متغیر ہے۔

مجھے تو اس وقت سخت تعجب ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نہایت آزادی کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا کا وجود، وحی، نبوت وغیرہ سب خلاف عقل ہیں، آخر عقل سے کیا مراد ہے؟ یہ تمام باتیں کس کی عقل کے خلاف ہیں، اگر تمہاری عقل کے خلاف ہیں تو تمہاری جیسی بہت سی عقلوں کے موافق بھی ہیں، آخر تمہاری عقل کو ہی کیوں درست تسلیم کیا جائے، اگر یہ کہا جائے کہ بڑے بڑے فلاسفر کی عقلوں کے خلاف ہے، تو اسی طرح بڑے بڑے فلسفیوں کی عقلوں کے موافق بھی ہے غرض کہ دنیا میں عقل کا کوئی معیار نہیں ہے جس کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے، اور جب عقل کا کوئی معیار نہیں تو ایسی حالت میں کسی اہم مسئلہ کو صرف یہ کہہ کر ٹال دینا کہ خلاف عقل ہے، حد درجہ شرمناک غلطی ہے اور عوام کو دھوکا دینا ہے۔

اگر کوئی چیز عقل سے حاصل نہ ہو سکے تو اس کی دو ہی وجہیں ہونگی یا تو کسب کے وقت مبادیات ہی میں عقل بھٹک گئی اور غلط راستہ پر جا پہنچی جیسا کہ بڑے بڑے فلسفیوں کی غلطیاں اس پر شاہد ہیں کہ مبادیات اور مقدمات میں غلطی کھا جانے کی وجہ سے صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکے، یا وہ چیز دائرہ عقل و حواس سے باہر ہے اس کا حصول فطرتاً ہوتا ہے کسب کو اس میں دخل نہیں ہوتا، وجود باری کا عقیدہ فی الواقع اسی دوسری قسم میں داخل ہے اگر خدا کا وجود عقل سے سمجھ میں نہ آ سکے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ عقلی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک فطری جذبہ ہے۔ لہٰذا اس بناء پر خدا کی ہستی کا انکار کر دینا سخت غلطی ہے۔ (۸۱)

•

دوسرے لفظوں میں انسانی عقل خدا کے وجود اور اس کی کچھ صفات کے متعلق صحیح اور مکمل علم حاصل کرنے کی استطاعت رکھتی ہے۔ خاص کر ان صفات کے متعلق جن کو جاننا ہماری فلاح کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن بعض صفات ایسی ہیں کہ اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خدا کی ذات انسانی فہم و عقل کی رسائی سے بہت ماوراء ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ خدا ازلی و ابدی ہے اور انتہائی کمالات کا جامع ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم جیسی محدود ہستی کے لئے اس کی ذات کا علم حاصل کرنا ناممکن ہے۔ یہی نتیجہ دوسری طرح بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہر معلوم شے کا علم جاننے والے کے طریقے پر منحصر ہے۔ طامس اور دوسرے عیسائی حکماء نے ارسطو کے اس اصول کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ لیکن چونکہ انسان بظاہر ایک کمزور ہستی ہے جس کی عقل محدود ہے۔ اس لئے جو علم بھی اسے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی محدود نگاہ اور ناقص رسائی کا غماز ہوتا ہے۔ خاص کر اس وقت جب علم کا موضوع ذات لامحدود ہو۔ اس نقص علم کی بہترین مثال وہ ہے۔ جب ہم خدا کے ساتھ صفت بسیط منسوب کرتے ہیں۵۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ خدا اپنی ذات میں بسیط ہے کیونکہ جو چیز بھی مرکب ہے وہ بالقوہ صفات رکھتی ہوگی۔ کم از کم اس کے اجزاء میں بکھرنے اور تحلیل ہونے کی بالقوہ صفت موجود ہوگی۔ چونکہ خدا خالص بالفعل ذات ہے جس میں کوئی بالقوہ صفت موجود نہیں اس لئے وہ بسیط مطلق ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی صفات میں مکمل وحدت ہے۔ اس کی ذات، وجود ازلیت، خیر، صداقت وغیرہ سب ایک ہیں۔ لیکن چونکہ یہ صفات جہاں تک ذہن انسانی سمجھ سکا ہے، ایک دوسرے سے مختلف ہیں لہٰذا ہمارے لئے ان صفات کا خدا کی ذات میں ایک ہونا بعید از فہم معلوم ہوتا ہے۔ پس جب ہم ذات خداوندی کا بیان کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان صفات کا یوں ذکر کرتے ہیں گویا وہ ایک دوسرے سے علیحدہ اور متمیز ہیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ خدا بسیط ہے تاہم اس کے متعلق ہم اس طرح گفتگو کرتے ہیں کہ وہ ان مختلف صفات سے مرکب ہے۔

ان مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے تدریجی طور پر خدا کے متعلق انسانی علم کی رسائی کا مسئلہ کافی پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اب ہم کیتھولک حکماء کے پیش کردہ حل پر نظر ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے ہمارا طرز بیان خدا کے بسیط ہونے کے منافی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بسیط ہے۔ اس تضاد سے تو یہ نتیجہ نکلتا معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم انسانی عقل کی اہلیت کا اقرار کرتے ہیں تو شاید یہ زیادتی اور مبالغہ ہے۔ اگر ہمارا علم انسانی ذہن کی پابندیوں سے محدود اور متاثر ہے تو ہم کس طرح ایک لامحدود ہستی کے متعلق اعتماد

---

۵ رد المخالفین ۱، ۱۸

وثوق سے کچھ کہہ سکتے ہیں اور کس طرح ہمیں یہ یقین ہو سکتا ہے۔ کہ جو کچھ صفات ہم اس سے منسوب کر رہے ہیں وہ واقعی اس کی ذات پر ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ کیا ہماری عقل کی تنگ دامانی اور شعور کی کوتاہیوں کے باعث ہمارے الفاظ کا مفہوم اس کی ذات کی ماہیت کو غلط نہیں پیش کرتا ؟ اگر خدا واقعی ذات بسیط ہے تو ہم ایسی صفات کو اس کی ذات کے ساتھ کیسے منسوب کر سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف اور متمیز ہے؟ اور اگر ہم ایسی متمیز صفات کو اس کے ساتھ منسوب کرتے ہیں تو ہمیں کیسے یقین ہے کہ ان کا مفہوم اُس مفہوم سے مماثل ہے، جب ہم ان صفات کو انسان جیسی محدود ہستی کے متعلق استعمال کرتے ہیں؟ اگر ہمیں اس کا یقین نہیں تو پھر ایسی صفات سے اس کی ذات کے متعلق کوئی صحیح علم حاصل ہونے کا امکان نہیں۔ وہ محض الفاظ اور اصطلاحات ہیں جو ہر قسم کے معنی اور مفہوم سے عاری ہیں۔ خدا ایک پر اسرار مجہول ہستی رہ جاتا ہے جس کی ذات کا تو شاید مبہم طور پر ہم اثبات کر سکیں لیکن جس کے متعلق ہم کوئی ایسا بیان نہ دے سکیں جس کا کوئی ایجابی مفہوم ہو۔

کیتھولک مفکرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ذات خداوندی سے بحث کرتے ہوئے ہم دو فرق ملحوظ رکھتے ہیں۔ اول، ہمیں دو مختلف قسم کی صفات میں تمیز کرنا چاہیئے۔ ایک قسم کی صفات وہ ہیں جو اساسی طور پر سلبی ہیں۔ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے مضمرات ایجابی ہیں۔ پہلی قسم کی صفات مثلاً ازلیت اور لامحدودیت ہیں۔ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کی ذات اُن حدود اور پابندیوں سے جو مخلوق میں نظر آتی ہیں، بالا اور پاک ہے۔ ایسی صفات کو خدا کی ذات سے منسوب کرنا بالکل صحیح ہے۔ ان سے کوئی مذکورہ بالا مشکل پیدا نہیں ہوتی کیونکہ ان کے ذریعے ہمیں خدا کی ذات کا کوئی ایجابی علم حاصل نہیں ہوتا۔ ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذات حدود و پابندیوں سے ماوراء اور منزہ ہے۔ یہ مشکل تو صرف ایجابی صفات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کو ذات خداوندی سے منسوب کرنا انسانی زندگی پر قیاس کا نتیجہ ہے۔ دونوں حالتوں میں الفاظ کا مفہوم مشابہ ضرور ہے اگرچہ ایک دوسرے کا عین نہیں۔ بعض صفات اپنی تعریف کی رو سے نقائص کی طرف دلالت کرتی ہیں۔ ایسی صفات وہ ہیں جن سے ذات کا مادی حالات یا عارضی جذبات پر منحصر ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اگر ایسی صفات کو خدا کے ساتھ منسوب کیا جائے ــ جیسا کہ بائیبل میں آتا ہے۔ کہ بعض موقعوں پر خدا کو غصہ آیا ــ تو یقیناً یہ مجازی معنوں میں ہوگا۔ ان صفات سے خدا کی ذات کا کوئی علم حاصل نہیں ہوتا۔ الٰہیین کی اصطلاح میں یہ "تناسبی قیاس" ہے۔ لیکن دوسری صفات سے کوئی نقص ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ صفات مندرجہ ذیل ہیں:۔

وحدت، وجود، خیر، صداقت۔ چونکہ ان صفات کا مفہوم کسی قسم کی شرائط اور پابندیوں سے

محدود نہیں اس لئے ہم ان کو خدا کی ذات سے منسوب کر سکتے ہیں جس طرح ہم انہیں دوسرے کے متعلق استعمال کر سکتے ہیں۔ یہی اصول دوسری صفات مثلاً حکمت، ارادہ، حیات، کے متعلق بھی کار فرما ہو گیا ہے حکمت کا مفہوم وجود اور صداقت کو سمجھنا ہے، یعنی جہاں کہیں بھی اور جس صورت میں بھی وہ شکل پذیر ہوا۔ اس طرح ان کی ذات میں کوئی نقص یا پابندی مضمر نہیں۔ ایسی صفات سے بے شک خدا کی ذات کے متعلق ایجابی اور صحیح علم میسر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ یہاں بھی عینیت کی بجائے قیاس اور تشبیہ ہی کارفرما ہے کیونکہ خدا کی ذات لامحدود ہے اس لئے یہ صفات بھی جب اس کی طرف منسوب ہونگی یقیناً انسانوں کی نسبت ان کے اطلاق میں بے اندازہ وسعت اور گیرائی موجود ہوگی۔ تاہم ان کا اساسی مفہوم وہی ہوگا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ذریعے ہمیں خدا کی ذات کا جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے وہ صحیح ہے اور یقین واثق ہے کہ جو کچھ ان صفات سے منطقی طور پر مستنبط ہوتا ہے وہ ہم اس کی ذات سے اسی طرح منسوب کر سکتے ہیں جس طرح دوسری مخلوق سے جو ان صفات کی حامل ہے۔ اس کو اصطلاحی زبان میں "قیاس محمولی" کہتے ہیں جو "قیاس تناسبی" سے علیحدہ شے ہے۔

یہ امتیازات اور وہ نتائج جن تک ہم ان کی مدد سے پہنچے ہیں۔ کیتھولک فلسفے کے لئے بہت اہم ہیں۔ جہاں تک خدا کے متعلق انسانی علم کا معاملہ ہے۔ اس فلسفے کی بنیاد تین مفروضات پر ہے:

(۱) انسانی عقل مابعد الطبیعیاتی طور پر کسی حد تک اس عمل تفہیم کے اہل ہیں۔

(۲) لیکن اس کے بعد وہ بالکل درماندہ ہے۔

(۳) اس حد کا تعین بھی اسی عقل کے ذمے ہے جس کی وہ ہر طرح سے اہل ہے۔

پہلے مفروضے کے بغیر آخری سند عقل کی بجائے وحی اور الہام قرار پائے گا۔ اور اس لئے وہ لوگ جو موخر الذکر کو قابل استناد تصور نہیں کرتے، کسی بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اگر ہم دوسرے مفروضے کو تسلیم نہ کریں تو پھر وہ بات جو عقل سے ماوراء ہے، قابل قبول نہ ہوگی۔ چونکہ خدا کی ماہیت انسانی عقل کی رسائی میں ہے اس لئے وہ ماورائیت اور تنزیہ سے خالی ہوگا اور غیر انسان کو کسی قسم کی ہدایت کے لئے وحی کی ضرورت نہ ہوگی۔ تیسرے کے بغیر پہلا مفروضہ خود بہ خود ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر عقل اپنی حدود کو متعین نہیں کر سکتی، اگر ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ عقل کی رسائی یہاں تک تو ہے لیکن اس کے بعد اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ بالکل ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جائے گا کہ وہ کہاں کہاں حق و صداقت تک پہنچ سکتی ہے اور کہاں نہیں۔ (۶۰)

یہ بحث کہ جو طاقت قدیم اور غیر حادث مانی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی کہ عدم محض ہی نہیں تھا

وہ طاقت قدیم کس طرح وجود پذیر ہوئی، یہ ایک ایسا سوال ہے جو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ جب ہم ایک طرف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی بھی عدم محض نہیں تھا اور ایک ذات قدیم سے تھی اور اسی کی بدولت موجودہ ہستیاں دولتِ ہستی سے فیض یاب ہوئی ہیں تو یہ جواب ہوگا کہ ہم اس ذات کی حقیقت اور کنہ سے واقف نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ ایک حادث ہستی اس قدیم غیر مخلوق ہستی کی کنہ سے کس طرح واقف اور شناسا ہوسکتی ہے ہاں اس کی قدامت اور ہستی کا تو علم ہوسکتا ہے لیکن اس کی کنہ اور ماہیت کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایک محدود ہستی غیر محدود ہستی کا کماینبغی ادراک نہیں کرسکتی۔ اگر مادہ اور روح بھی قدیم ہے تو لازمی ہے کہ ہماری روحیں اور مادہ جس سے ہم خلقت پذیر ہوئے ہیں۔ اس قدیم طاقت کی حقیقت اور کنہ سے واقف ہوسکے۔ کیونکہ جب ان تینوں اقانیم کی نوعیتِ قدامت اور حقیقت ایک ہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مادہ اور ہماری روح اس شناخت کی وجہ سے معذور ہو۔ جب مادہ اور ہماری روح دونوں اس مرحلہ پر آکر رہ جاتے ہیں اور مادہ تو بالکل ہی بے حس ہے تو ہم کس طرح اس قدیم کی کنہ سے واقف ہوسکتے ہیں۔ (۱۹)

زیادہ غور و خوض کرنا ممنوع ہے

اسی طرح اس کی دوسری صفات کی کیفیات میں اس مقدار سے جو سرکارِ محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام نے بیان کر دی ہیں زیادہ غور و خوض کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ صفات میں غور و فکر کرنے کی بازگشت خدا کی ذات میں فکر کرنے کی طرف ہوتی ہے جس میں فکر کرنے کی کثیر اخبار میں ہمیں ممانعت کی گئی ہے (لیلیہ ص۴۲ سطر۹)

- صدوق، ابن بابویہ — اعتقادات ص۱۷۷ سطر۳ — سرگودھا

خداوند عالم کے بارے میں جدل و جدال۔ کج بحثی اور فضول گفتگو سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی باتوں سے ایسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ جو اس ذاتِ اقدس کی شان قدوسیت کے ہرگز لائق نہیں خدا کے اس قول کہ "خدا کی طرف انتہا ہوتی ہے"، کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:۔ "جب خدا کے بارے میں کوئی بات چیت شروع ہو۔ تو تم اس وقت خاموش ہو جاؤ"۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ اے فرزند آدم تیرا دل تو اتنا ہے کہ اس سے کوئی پرندہ اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا۔ اور تیری آنکھ کی یہ حالت ہے کہ اس پر اگر سوئی کے ناکے کے برابر کوئی چیز رکھ دی جائے تو وہ چھپ جائے۔ کیا تو اپنی ان دو طاقتوں کے بل بوتے پر خدا کی سلطنت جو آسمان و زمین پر مشتمل ہے کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اس سورج کو جو خدا کی ایک مخلوق ہے اپنی آنکھ میں رکھ کر تو دیکھ اگر ایسا کر لیا تو ثابت ہو

ہو جائے گا کہ جیسا کہ تو کہتا ہے ویسا ہی ہے۔

● مجلسی، محمد باقر عین الحیوٰۃ ص۴۰ سطر ۱۲ امامیہ ایجنسی ، لاہور

خدا تعالیٰ کی حقیقت ذات اور کیفیت صفات کا معلوم کرنا واجب تعالیٰ کی اصل ذات کو پہچاننا ناممکن ہے۔ ایسے ہی صفات کی حقیقت کو بھی۔ کیونکہ صفات اُس کی عین ذات ہیں اور معلوم کرنے کی کوشش کرنا بھی منع ہے جو اپنی ذات اپنے بدن اور ظاہری اجسام کی اصلیت دریافت کرنے تک سے عاجز ہے وہ واجب الوجود کو کس طرح جان سکتا ہے۔ اس بارے میں اتنا ہی اعتقاد کافی ہے جس قدر خود اللہ تعالیٰ نے کلام پاک اور رسول اللہ صلعم اور آئمہ علیہم السلام نے حدیثوں اور خطبوں میں فرمادیا ہے۔ لبعد اسکے عبادت کر کے خدا تعالیٰ سے ہدایت کی دعا کرے۔ عقل ناقص پر مغرور نہ ہو۔ کیونکہ اس میں غور کرنے سے سوائے گمراہی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

چنانچہ معتبر روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور عجیب صنعتوں میں غور کرو اور اس کی ذات میں فکر نہ کرو کہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

دوسری روایت میں ہے۔ جس چیز پر چاہو بحث کرو مگر ذات خدا میں کلام نہ کرو۔ جناب صادق علیہ السلام سے بروایت معتبر منقول ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں فرمایا وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی ....." یعنی جب بات خدا تک پہنچے تو چپ ہو جاؤ۔ اور حدیث میں ہے کہ خدا کی ذات میں ہرگز فکر نہ کرو۔ ہاں اس کی مخلوق کی عظمت کو غور سے دیکھو۔

جناب علی بن الحسین علیہ السلام سے توحید اور خدا شناسی کے بارے میں لوگوں نے دریافت کیا۔ فرمایا: اللہ جل شانہٗ جانتا تھا کہ پچھلے زمانہ میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو میری بابت غور کریں گے۔ پس سورۃ قل ھو اللہ اور سورۂ حدید نازل فرمادیں کہ ان کے مطابق ذات باری کو معلوم کریں۔ اور اس سے زیادہ کہنا باعث گمراہی ہے۔

روایت ہے کہ جناب صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ۔ بارہ امام علیہم السلام معرفت الٰہی کے دروازے ہیں ان کی متابعت کے راستے سے راہ ہدایت و معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو خدا کو کوئی نہ جانتا۔ ان کے ذریعہ خدا نے حجت تمام کر دی بہت سی حدیثیں اس مضمون کی وارد ہوئی ہیں۔ اکثر علم والوں کو شیطان نے فریب دیا ہے کہ اپنی ناقص عقل پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور خدا اور رسول کے قول کو چھوڑ دیا ہے۔ اپنے خیال کے مطابق خدا کو بتلایا ہے لیکن سب غلطی پر ہیں۔ اگر اس معاملہ میں عقل رسا ہوتی۔ تو اس قدر حکماء اشراقی اور متکلمین کا اتفاق کیوں نہ ہوتا۔ اور اختلاف کیوں کرتے۔

● مجلسی، محمد باقر حق الیقین ص۱۶ سطر آخر امامیہ ایجنسی لاہور

جاننا چاہیئے کہ خدا کی کنہ ذات وصفات کماحقہ کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور حضرت پیغمبر آخرالزمان نے جو کہ اشرف المخلوقات اور افضل عارفان ہیں اپنے عجز کا اقرار کیا ہے۔ اور فرمایا ہے "ما عرفناک حق معرفتک" یعنی ہم نے تجھے نہیں پہچانا جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے "ما قدروا اللہ حق قدرہ" یعنی خدا کا اندازہ اور تعظیم نہیں کی ہے۔ جیسا کہ سزاوار ہے اور فرمایا کہ "لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار" یعنی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ اور وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے۔ اور حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ دیدۂ دل اُس کی کنہ کا ادراک نہیں کر سکتا۔ نیز حواس ظاہرہ سے بھی یعنی سننے، سونگھنے، چھونے اور چکھنے سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اور نہ حواس خمسہ باطنی سے مثل وہم وخیال کے۔

قرآن مجید اور کلام معصومین علیہم السلام سے ثابت ہے کہ ذات وصفات خدا کی حد بندی محال ہے اسی لئے معصومین علیہم السلام نے فرمایا ہے کہ تصورِ توحید بمقدار عقل ہوتا ہے۔ یعنی جتنی عقل ہوگی اسی درجہ کا توحید کا تصور ہوگا۔ کیونکہ کوئی عاقل وعالم اس کی حقیقت ذات وصفات تک نہیں پہنچ سکتا مگر وہی خود اپنی ذات کو جانتا ہے۔ لا یعلم ما ھو الا ھو۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے مگر وہ خود ہی جانتا ہے کہ وہ کیا ہے وہ ہمارے احاطۂ علم وفکر سے بالاتر ہے۔ اور اس کے صفات عین ذات ہیں۔ یعنی بس وہ ذات ہی ذات ہے اور اس کے آثار کے نام صفات ہیں۔ لہٰذا نہ اس کی ذات کی حد ہے نہ صفات کی۔ (حقائق الوسائط جلد ۱ ص ۵۹ سطر ۱۷)

کیفیت میں بات نہ کریں

- کلینی، اصول کافی جلد ۱ ص ۱۲۵ سطر ۱ تہران، ص ۱۰۲ سطر ۲ کراچی

حضرت ابو بصیر سے روایت ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: کہ خلق خدا کے متعلق کلام کرو لیکن خدا کے بارے میں نہیں۔ خدا کے بارے میں کلام کرتے سے آدمی کی حیرت بڑھتی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ہر شے کے متعلق کلام کرو سوائے ذات باری کے۔

- مجلسی، محمد باقر مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۶ حدیث ۱ ایران
- ملا خلیل الصافی جلد ۲ ص ۶۵ سطر ۵ نولکشور انڈیا
- ملا محسن فیض کاشانی الوافی جلد ۱ ص ۸۶ سطر ۱۰ تہران
- کلینی اصول کافی جلد ۱ ص ۱۲۵ سطر ۴ تہران، ص ۱۰۲ سطر ۶ کراچی

سلیمان بن خالد نے کہا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: تمہارے رب کی طرف انتہا ہے۔ بس

جب کلام کی انتہاء رب کی طرف ہو تو خاموش ہو جاؤ ۔

- محمد باقر مجلسی — مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۷ حدیث ۲ — ایران
- ملا خلیل — الصافی جلد ۲ ص ۶۵ سطر ۱۲ — نولکشور انڈیا
- ملا محسن فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ ص ۸۲ سطر ۱۴ — تہران
- کلینی — اصول کافی جلد ۱ ص ۱۲۵ سطر ۸ تہران ۔ ص ۱۰۱ سطر ۱۰ — کراچی

محمد بن مسلمؒ نے کہا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کیا کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے بارے میں بھی کلام کرتے ہیں ۔ جب تم ایسا کلام سنو ۔ تو کہو لا الٰہ الا اللہ ۔ وہ ایسا واحد ہے کہ کوئی سے اس کی مثل نہیں ۔

- مجلسی، محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۷ حدیث ۳ — ایران
- ملا خلیل — الصافی جلد ۲ ص ۶۷ سطر ۲ — نولکشور انڈیا
- فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ ص ۸۲ سطر ۱۵ — تہران
- کلینی — اصول کافی جلد ۱ ص ۱۲۵ سطر ۱۲ تہران ۔ ص ۱۰۲ سطر ۱۲ — کراچی

حضرت ابو عبیدہ خداءؒ نے کہا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ۔ اے زیاد ! پرہیز کرو منازعات سے کہ یہ شکوک کو پیدا کرنے والی چیز ہے ۔ اور صاحب نزاع کو مستحق جہنم بنا دیتی ہے ۔ اور کبھی وہ ایسا کلام کر جاتا ہے کہ جس کو خدا نہیں بخشے گا ۔ گذشتہ زمانوں میں ایسے لوگ ہوئے ہیں کہ انہوں نے علم کو چھوڑ دیا ۔ جس کا جاننا انہیں لازم تھا اور غیر ضروری کو حاصل کیا ۔ یہاں تک کہ ان کا مباحثہ ذات باری تک پہنچا جس نے انہیں حیرت میں ڈال دیا ۔ یہاں تک کہ اگر کوئی پیچھے سے اس کو پکارے ۔ تو جواب آگے سے دیتے ہیں اور جب آگے سے پکارے تو جواب پیچھے سے دیتے ہیں ۔

- محمد باقر مجلسی — مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۷ حدیث ۴ — ایران
- ملا خلیل قزوینی — الصافی جلد ۲ ص ۸۲ سطر ۹ — نولکشور انڈیا
- فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ ص ۸۲ سطر ۱۶ — تہران
- کلینی — اصول کافی جلد ۱ ص ۱۲۶ سطر ۲ تہران ۔ ص ۱۰۲ سطر آخر — کراچی

مباح کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جس نے اللہ کی کیفیت پر غور کیا وہ ہلاک ہو گیا ۔

- مجلسی، محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۷ حدیث ۵ — ایران

- خلیل قزوینی — الصافی جلد ۲ صفحہ ۶۸ سطر ۸ — نولکشور بھارت
- فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ صفحہ ۸۲ سطر ۲۱ — تہران
- کلینی — اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۲۶ سطر ۵ تہران۔ صفحہ ۱۰۳ سطر ۱ کراچی

زرارہ بن اعین سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک عظیم المرتبت فرشتہ خدا کے بارے میں غور کرنے لگا۔ پس وہ پتہ نہ چلا سکا۔ کہ خدا کہاں ہے۔ یعنی آدمی کا کیا ذکر فرشتہ کو بھی حقیقت باری تعالیٰ کا علم نہیں۔

- مجلسی محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ صفحہ ۸۳ حدیث ۶ — ایران
- خلیل قزوینی — الصافی جلد ۲ صفحہ ۶۸ سطر ۱۰ — نولکشور
- فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ صفحہ ۸۲ سطر ۲۳ — تہران
- کلینی — اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۲۶ سطر ۸ تہران ۔ صفحہ ۱۰۳ سطر ۵ کراچی

محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ خدا کے بارہ میں تفکر سے بچو۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ اس کی عظمت پر غور کرو تو اس کی عظیم مخلوق کو دیکھو۔

- مجلسی، محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ صفحہ ۶۷ حدیث ۷ — ایران
- خلیل قزوینی — الصافی جلد ۲ صفحہ ۶۸ سطر ۱۵ — نولکشور بھارت
- فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ صفحہ ۸۲ سطر ۲۶ — تہران
- کلینی — اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۲۶ سطر ۱۰ تہران ۔ صفحہ ۱۰۳ سطر ۸ کراچی

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ اے ابن آدم اگر ایک طائر تیرے قلب کو کھالے۔ تو اس کا پیٹ نہ بھرے گا۔ اور اگر ایک سوئی کا ناکہ تیری آنکھ پر رکھ دیا جائے تو وہ اس کو ڈھانپ لے گا۔ تو کیا ان دونوں چیزوں سے نظام سماوات وارض کو جاننا چاہتا ہے۔ اگر تو اس ارادے میں سچا ہے۔ تو یہ سورج کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے۔ اگر تیری آنکھوں میں طاقت ہے تو ذرا نظر جما کر دیکھ لے تو معلوم ہو کہ جیسا تو کہتا ہے ویسا ہی ہے۔

- مجلسی، محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ صفحہ ۶۷ حدیث ۸ — ایران
- خلیل قزوینی — الصافی جلد ۲ صفحہ ۶۸ سطر ۲۱ — نولکشور بھارت
- فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ صفحہ ۸۴ سطر ۲۹ — تہران
- کلینی، — اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۲۷ سطر ۱ تہران ۔ صفحہ ۱۰۳ سطر ۱۵ کراچی

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک یہودی سبحت نامی حضرت رسول خدا کی خدمت میں آیا اور کہا میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے جواب دیا تو ٹھیک ہے ورنہ واپس جاؤں گا فرمایا جو چاہے پوچھ۔ اس نے کہا یہ بتایئے۔ آپ کا رب کہاں ہے؟ فرمایا ہر جگہ ہے کسی مکان میں محدود نہیں پوچھا پھر وہ کس حال میں ہے۔ فرمایا میں اپنے رب کی کیفیت کیوں کر بتاؤں۔ کیفیت تو اس کی مخلوق ہے۔ اور مخلوق کے وصف سے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس نے کہا پھر کیسے پتہ چلے۔ کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ پس کوئی حجر یا مدر ایسا باقی نہ رہا کہ اس نے صاف عربی میں یہ نہ کہا ہو۔ اے سبحت یہ رسول اللہ ہیں۔ یہ سن کر سبحت نے کہا۔ میں نے آج سے زیادہ اس معاملہ میں واضح تر اور کوئی دن نہیں دیکھا۔ پھر اس نے توحید باری تعالیٰ اور آنحضرت صلعم کی رسالت کی گواہی دی۔

- مجلسی، محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ ص۶۷ حدیث ۹ — ایران
- خلیل قزوینی — الصافی جلد ۲ ص۶۹ سطر ۱۲ — نولکشور انڈیا
- فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ ص۸۳ سطر ۳۳ — تہران
- کلینی — اصول کافی جلد ۱ ص۱۲۷ سطر ۹ تہران — ص۱۰۴ سطر ۱ کراچی

عبدالرحمان بن عتیک قصیر نے کہا کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ صفت خدا کیا ہے؟ تو آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر فرمایا۔ بلند مرتبت ہے۔ خدا بلند مرتبت ہے خدا جس نے اس کی کنہہ ذات کو معلوم کرنا چاہا۔ تو وہ ہلاک ہوا۔

- مجلسی، محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ ص۶۷ حدیث ۱۰ — ایران
- خلیل قزوینی — الصافی جلد ۲ ص۷ سطر ۲۰ — نولکشور انڈیا
- فیض کاشانی — الوافی جلد ۱ ص۸۲ سطر آخر — تہران

معرفت خدا محتاج ماہیت نہیں

- منتظری، حسین — رسالہ توحید جلد ۲ شمارہ ۶ ص۵۵ سطر ۶ — قم

جب کسی چیز کی ذات کی معرفت حاصل کرنا ہو تو اس کی جنس، فصل اور ماہیت کو سمجھنا چاہیئے جیسے انسان کی تعریف جب بیان کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانیت اور ناطقیت سے مرکب ہے اس کی جنس حیوانیت اور فصل ناطقیت ہے۔ یہاں انسان کی ماہیت کا تجزیہ دو حصوں میں کیا گیا ہے۔ جنس اور فصل اور ان دونوں چیزوں سے مل کر ایک ماہیت مرکبہ معرض وجود میں آئی ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ

انسان ایک ماہیت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک حد وجود رکھتا ہے ۔ لیکن خدا ماہیت نہیں رکھتا انسان مرکب ہے اس لئے محتاج ہے اور خدا بے نیاز ہے ۔

جب یہ معلوم ہو چکا کہ ماہیتیں حد وجود ہیں اور خدا غیر متناہی ہے تو اس کے یہاں نہ ماہیت پائی جائے گی اور نہ حدود ۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ماہیت جنس وفصل سے مرکب ہوتی ہے اور خدا ماہیت نہیں کہ جو مرکب اور محتاج ہو ۔ وہ غنی علی الاطلاق اور بے نیاز ہے لہٰذا نہ تو خدا کو درک کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی کنہ حقیقت تک کوئی پہنچ سکتا ہے ۔ ماہیتیں جو کہ مخلوقات خدا ہیں ان میں جنس وفصل پائی جاتی ہے ۔ اس لئے جنس وفصل کے ذریعہ ماہیتوں کو سمجھا جاسکتا ہے ۔ بنابرایں حضرت امیرالمومنین کے نقرہ "**کل معروف بنفسہ مصنوع**" سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس چیز کی ذات کو انسان پہچاننا چاہتا ہے ۔ اور اس کی کنہ ذات کو درک کرنا چاہتا ہے تو اس کی وہ کنہ ذات جو دماغ انسان میں موجود ہوتی ہے وہی اس کی ماہیت ہوتی ہے ۔ اور ہر شے کی ماہیت میں جنس وفصل پائی جاتی ہے اس لئے وہ شے مرکب ہوتی ہے اور ہر مرکب مصنوع ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جو چیز آپ کے ذہن میں ہے وہ آپ کے ذہن کی پیداوار ہے ۔ لیکن حقیقت خدا وجود غیر متناہی ہے محال ہے کہ وہ ذہن میں سما سکے اس لئے کہ ذہن محدود ہے اور غیر محدود محدود میں نہیں سما سکتا ۔ ذہن مخلوق ہے خالق محدود مخلوق میں کسی بھی صورت سے نہیں سما سکتا ۔ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ خدا کو صفات سلبیہ اور صفات اضافیہ کے ذریعہ پہچانا جا سکتا ہے عین ذات کو سمجھنا محال ہے ۔ لہٰذا اگر کسی چیز کی ذات کو سمجھنا چاہیں تو اس میں ماہیت ہوگی اور ہر ماہیت جنس وفصل کی حامل ہوتی ہے وہ شے مخلوق اور خدا کی پیدا کی ہوئی ہوگی جو شے انسانی دماغ میں سمائے گی وہ انسانی دماغ کی پیداوار ہوگی اور انسان کا دماغ بھی مخلوق خدا ہے اس میں آنے والی صورت ذہنی بھی خدائی مخلوق ہے ۔ خدا کی ذات کبھی بھی قابل درک نہیں ہے ۔

ماہیت نہیں

● نسفی، نجم الدین عقائد ص۴۳ سطر آخر ، تہذیب العقائد ص۲ سطر ۱۲ کراچی

خدا ماہیت کے ساتھ وصف نہیں کیا جاسکتا ۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے لئے ماہیت ہوگی تو اس کے لئے دوسری متجانسات سے تمیز و تخصیص کرنے کو فصول مقومہ کی حاجت پڑے گی جس سے ترکیب لازم آتی ہے کیونکہ ماہیت جزو عام ہوتی ہے جسے جنس اور نوع کہتے ہیں ۔ اور جو جزو اس کی تخصیص کرتا ہے وہ جزو خاص ہوتا ہے ۔ اس جزو مخصص کو فصل کہتے ہیں ۔ اور بعض نسخوں میں بجائے ماہیت کے مائیت ہمزہ کے ساتھ واقع

ہے جو منسوب ہے طرف لفظ ما کے جب کہتے ہیں مَا هُوَ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ یہ کس جنس سے ہے۔ یعنی اس لفظ کے ساتھ حقیقت جنسی کا استفسار ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں بھی وہی قباحت لازم آتی ہے۔ جو ہم نے ماہیت بالطار کی شرح میں بیان کی ہے۔ یعنی مجانست کی حالت میں ان چیزوں سے تمیز حاصل کرنے کے لئے جو اس جنس میں داخل ہیں۔ فصول مقومہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس یہ بھی مستلزم ہے ترکیب کو۔

معرفت حقیقت خدا ناممکن ہے

اس امر میں غور کرنا کہ خدا تعالیٰ کیا چیز ہے کس طرح کا۔ کس کیفیت کا ہے۔ کب سے ہے۔ کب تک رہے گا۔ کہاں ہے۔ کس جگہ ہے۔ بالکل بے کار اور غیر مفید بات ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں از قسم موجودات پائی جاتی ہیں۔ خواہ وہ علوی ہوں یا سفلی۔ نورانی ہوں یا ظلماتی۔ جسمانی ہوں یا روحانی۔ جنسی ہوں یا نوعی۔ فردی ہوں یا شخصی۔ جوہر ہوں یا عرضی۔ غرض بالائے آسمان سے لے کر زیر زمین تک جتنی چیزیں موجود ہیں۔ وہ سب کی سب مخلوق باری تعالیٰ ہیں تو لامحالہ وہ خود ان سب سے علیحدہ اور غیر قسم کا ہوگا۔ کیونکہ یہ سب چیزیں حادثات ہیں۔ اور خود وہ واجب الوجود ہے۔ اور ممکن نہیں کہ دونوں قسموں میں کسی طرح کی باہم شباہت ہو۔ پس جتنے اوصاف اور حالات ان ممکنات کے لئے لازم یا عرضی مفارق ہیں۔ وہ ہرگز اس کی ذات میں نہ پائے جاتے ہوں گے۔ یہ تمام ممکنات اپنے وجود خاص میں محتاج مکان و حیز ہیں۔ تو لامحالہ اس کے لئے کوئی مکان ہوگا۔ پس یہ کہنا کہ وہ کہاں ہے کیا معنی رکھتا ہے۔ یا یہ کہ یہ تمام ممکنات لازم التشکل ہیں تو لامحالہ وہ ان سے مغائر ہونے کے سبب سے کوئی شکل و صورت نہ رکھتا ہوگا۔ پس یہ کہنا کہ وہ کس شکل کا ہے کیا معنی رکھتا ہے۔ یا یہ کہ تمام ممکنات ایک خاص زمانے سے وجود میں آئی ہیں تو ان کو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں وقت سے موجود ہیں۔ پس لامحالہ خالق الکل کے واسطے کوئی زمانہ ابتدائے وجود نہ ہوگا۔ ورنہ وہ بھی مثل ان کے حادث ہوگا۔ یا یہ کہ جتنے ممکنات ہیں ان میں کوئی نہ کوئی کیفیت ضرور پائی جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی عرض اُن میں ضرور موجود ہے مثلاً نرمی سختی۔ گرمی سردی ثقل و خفت۔ رنگ و بُو۔ این و وضع وغیرہ وغیرہ۔ پس لامحالہ اُس میں یہ اعراض قائم نہ ہوں گے ورنہ وہ محل حوادث ہوگا۔ اور پھر حادث ٹھہرے گا۔ حالانکہ وہ واجب الوجود ہے۔ ہم جو کسی موجود چیز کی حقیقت معلوم کرتے ہیں تو ہمارے پاس اُس کے معلوم کرنے کے صرف چھ آلے ہیں یا مس کر کے معلوم کریں گے۔ تو لازم ہے کہ وہ جسم ہو۔ حالانکہ خدائے تعالیٰ جسم نہیں۔ پس مس کیونکر ہو سکے گا۔ یا سونگھ کر معلوم کریں گے تو لازم ہے کہ وہ خوشبو یا بدبو ہو۔ حالانکہ خدائے تعالیٰ کوئی عرض نہیں۔ خوشبو اور بدبو اعراض میں ہیں۔ جو اپنے وجود میں غیر کے محتاج ہیں۔ جس میں ان کا قیام ہو۔ یا چکھ کر معلوم کریں گے۔ تو ضرور ہے۔ وہ ذائقہ دار چیز ہو حالانکہ خدا تعالیٰ کوئی کھانے یا پینے کی چیز نہیں۔ جسے چکھ کر معلوم کیا جا سکے۔ یا دیکھ کر معلوم کریں گے۔ تو لازم ہے کہ اُس میں

رنگ ہو۔ کیونکہ بغیر رنگ کے کوئی چیز دکھائی نہیں دے سکتی۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کے لئے جسم نہیں جس میں رنگ قائم ہو۔ ورنہ لازم آئے گا کہ وہ مرکب۔ اور پھر حادث ہو۔ یا سنکر معلوم کریں گے۔ تو ضرور ہے وہ آواز ہو حالانکہ خدا تعالیٰ میں آواز کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ آواز ایک حادث شے ہے۔ جو ہوا کے تصادم دو دو جسموں کے تصاک سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ان پانچوں حاسوں سے اُس کا محسوس ہونا ناممکن ہے۔ تو اس کی حقیقت کوئی شخص کس ذریعے سے معلوم کر سکتا ہے۔ رہی قوت دماغیہ وہ صرف اُسی وقت کام کرتی ہے جبکہ کوئی شے ان حواس خمسہ ظاہریہ کے ذریعے سے بطور مادہ یا صورت یا اثر کے اُس تک پہنچتی ہے۔ پس چونکہ حواس ظاہرہ آج تک خدا تعالیٰ کا مادہ اور نہ صورت معلوم کر سکے۔ لہٰذا اُس کی حقیقت کا معلوم ہونا قوت مفکرہ سے بھی ناممکن ہے۔ باقی رہا اثر سے مؤثر کا پتہ چلانا سو وہ بحمد اللہ ہم کو اور نیز ہر باعقل و تمیز شخص کو معلوم ہے۔ دیکھتے ہیں کہ اُس کے آثار قوت کروڑ در کروڑ عالم میں موجود ہیں اس وجہ سے ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ان کا مؤثر ضرور ہے اور وہی خالق الکل اور مبدع الکل ہے مگر اتنا جاننے سے اُس کی حقیقت پالینا ناممکن ہے اس وجہ سے سخت حماقت ہے کہ اُس کی ذات کے معاملہ میں غور کیا جائے بلکہ صرف ہم کو اس قدر معلوم کر لینا کافی ہے کہ وہ ایک ذات واجب الوجود و قدیم ازلی ہے۔ جو خالق کل موجودات ممکنہ ہے اور اُس میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں۔ جو بحیثیت کمال لازم ہوتی ہیں۔ مگر یہ کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ اس میں غور کرنا نہ مفید ہے اور نہ اس سے اُس کی حقیقت کا معلوم ہونا امکان بشری میں ہے۔

اسی مطلب کو خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب مجید میں ظاہر فرمایا ہے وما قدروا اللہ حق قدرہ (الزمر) نہیں عظمت کی ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جو حق عظمت ہے کیونکہ اس کے لئے ایسے اوصاف بیان کئے جو اس کی شان عظیم کے لئے زیبا نہیں ہیں۔ کسی نے تو کہہ دیا کہ وہ اولاد والا ہے کسی نے کہہ دیا اُس کے لئے جسم ہے۔ کسی نے کہا وہ بخیل ہے۔ کسی نے کہا وہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ وہ عرش پہ بیٹھا ہے۔ کسی نے اس کے لئے شرکا ہی تجویز کر دیئے جن کی یہ عبادت کرتے ہیں۔ کسی نے کچھ کہا۔ اور کسی نے کچھ۔ غرض حق تعظیم خدا تعالیٰ کسی نے ادا نہ کیا! اور وجہ اس کی صرف یہی ہے کہ اُس کو پہچان تو سکے نہیں۔ لہٰذا تخمین و ظن سے جو جی میں آیا۔ وہی اُس کے لئے تجویز کر دیا۔ جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ان اللہ لا یوصف وکیف یوصف وقد قال فی کتابہ وما قدروا اللہ حق قدرہ فلا یوصف بقدرہ الا کان اعظم من ذلک۔ بے شک خدا تعالیٰ کا وصف حقیقی بیان نہیں ہو سکتا اور کیونکر بیان ہو سکے۔ حالانکہ اُس نے خود اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ ما قدروا اللہ حق قدرہ لا پس جس قدر و انداز سے اس کا وصف بیان کیا جائے گا۔ یقیناً وہ اُس سے اعظم و برتر ہوگا۔ کیونکہ ہم جو کچھ بیان کر سکیں گے۔ وہ محسوسات ہی سے قیاس کر کے کہہ سکیں گے حالانکہ خدا تعالیٰ تمام محسوسات اور اُن کے اوصاف سے بالاتر ہے۔ (تفسیر صافی)

توحید بحار میں مروی ہے کہ جناب امیرالمومنین علیہ السلام سے کسی نے اس معاملہ میں عرض کی تھی۔ تو آپ نے ایک خطبہ فرما کر یہ ارشاد کیا کہ علیک یا عبد اللہ بما دلک علیہ القرآن من صفتہ وتقدمک فیہ الرسول من معرفتہ فائتم بہ استضئ بنور ہدایتہ فانما ھی نعمۃ وحکمۃ اوتیتھا فخذ ما اوتیت وکن من الشاکرین۔ اے بندہ خدا تجھ کو اسی قدر اوصاف خدا تعالیٰ کا جاننا لازم ہے جس قدر قرآن نے تجھ کو بتایا ہے اور اس سے پہلے رسولؐ نے اُس کی معرفت کے معاملہ میں ارشاد فرما دیا ہے پس تو اُسی کی اقتدا کر اور اُسی کے نور ہدایت سے روشنی حاصل کر بس یہی نعمت وحکمت ہے جو تجھے دی گئی ہے بس لے جو تجھے دیا گیا ہے اور شکر کر۔ (کیونکہ اگر قرآن کے بیانات اور رسول کے ارشادات سے زیادہ تو غور وخوض کرنا چاہے گا۔ تو بالکل لاحاصل ثابت ہوگا جبکہ خود رسول خدا سے مروی ہے کہ ماعرفناک حق معرفتک (اے معبود جو تیرا حق معرفت ہے ویسی معرفت اور شناخت تو مجھ کو حاصل نہیں ہوئی) تو دوسرا کوئی کیا جان سکتا ہے اور اس کی حقیقت کو کیا پہچان سکتا ہے۔ تمام انبیاء اور بڑے بڑے فلاسفر جو عموماً توحید خدا تعالیٰ کے قائل تھے۔ سوائے چند مجنون سائنٹفک فلسفیوں کے (جو غرور ہمہ دانی ہی کی وجہ سے محض نادان ثابت ہوئے) سب اس معاملہ میں ساکت رہے۔ اتنا سب نے بتایا کہ وہ قدیم ہے ازلی ہے حکیم ہے قادر ہے عالم ہے خبیر ہے۔ مدرک ہے۔ حی ہے متکلم ہے اور تمام ممکنات کے اوصاف سے بالاتر ہے۔ لیکن یہ کہ وہ کیا چیز ہے کوئی نہ بتا سکا۔ تو تو بیچارہ اس میں غور کر کے کیا پا سکتا ہے۔ زیادہ بریں نیست کہ جب تیری سمجھ میں اس کی حقیقت نہ آئے گی۔ تو اصل ہی کا انکار کر دے گا۔ اور کافر ہو جائے گا۔) اور پھر آپ فرماتے ہیں۔ وما کلفک الشیطان علمہ مما لیس علیک فی الکتاب فرضہ ولا فی سنۃ الرسول والائمۃ الھداۃ اثرہ فکل علمہ الی اللہ ولا تقدر علیہ عظمۃ اللہ الخ اور جس امر کے جاننے کی تکلیف شیطان نے تجھ کو دی ہے۔ یعنی تجھے یہ کہا ہے کہ خدا تعالیٰ کی حقیقت معلوم کر) جو نہ تجھ پر کتاب خدا کے ذریعہ سے فرض ہے اور نہ حدیث رسولؐ اور احادیث ائمہ ھداۃ میں اس کا اثر ہے۔ تو اس کا علم خدا ہی کے حوالہ کر۔ (اور اس کے معلوم کرنے کے درپے نہ ہو) اور (جان لے کہ) اس پر اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا"۔ نیز توحید بحار میں جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے سلیمان بن خالد کہتے ہیں کہ ابو عبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا۔ ایاکم والتفکر فی اللہ فان التفکر فی اللہ لا یزید الا تیھا ان اللہ تبارک وتعالیٰ لا تدرکہ الابصار ولا یوصف بمقدار" یعنی ڈرو تم لوگ ذات خدائے تعالیٰ میں غور وخوض کرنے سے کیونکہ خدائے تعالیٰ کے معاملہ میں فکر کرنا سوائے حیرانی وسرگردانی کے اور کچھ زیادہ نہیں کرتا۔ بے شک کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کو نہ آنکھیں محسوس کر سکتی ہیں اور نہ کسی مقدار واندازہ سے اس کا وصف بیان کیا جا سکتا ہے (تو کیونکر اُس کی حقیقت کسی کو معلوم

ہو سکتی ہے)۔

ہشام سے مروی ہے کہ جناب صادق علیہ السلام سے ایک زندیق (منکر وجود خدا تعالیٰ) نے سوال کیا کہ اِنَّ اللہ تعالیٰ ما ھو۔ خدا تعالیٰ کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا ھو شیٔ بخلاف الاشیاء وہ بخلاف تمام چیزوں کی ایک شے ہے۔ (یعنی اس کے مثل کوئی شے نہیں) ارجع بقولی شیٔ الی انہ شیٔ بحقیقۃ الشیئیۃ غیر انہ لا جسم ولا صورۃ ولا یحس ولا یجس ولا یدرک بالحواس الخمس لا تدرکہ الاوھام ولا تنقصہ الدھور ولا تغیرہ الازمان" اور میرا مطلب شے سے یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ایک شے ہے۔ جس کے لئے وجود اور شیئیۃ فی حد ذاتہ ثابت ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ نہ تو وہ جسم ہے نہ صورت ہے۔ نہ محسوس ہو سکتا ہے اور نہ ٹٹول کر دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ حواس خمسہ سے ادراک کیا جا سکتا ہے وہم و خیال اُسے معلوم نہیں کر سکتے (کیونکہ ان میں اتنی طاقت ہی نہیں) اور نہ دہر اُسے گھٹا سکتے۔ اور نہ زمانے اُس میں تغیر پیدا کر سکتے (کیونکہ جتنی چیزیں عالم کی زمانے کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ وہ سب حادث ہیں اور پروردگار عالم حدوث سے بری ہے۔ پس کیونکر اُس کی ذات میں تغیر کو دخل ہوگا۔)

نیز توحید بحار میں سہل سے مروی ہے کہ میں نے ابو محمد علیہ السلام کی خدمت میں ۲۵۵ ہجری میں ایک عریضہ لکھا کہ اے میرے سید ہمارے اصحاب معاملہ توحید میں اختلاف رکھتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ جسم ہے کوئی کہتا ہے وہ صورت ہے۔ پس آپ کی رائے ہو کہ اس معاملہ میں کچھ تعلیم فرما دیں جس سے مجھ کو واقفیت ہو جائے (معاملہ توحید میں) اور میں اُس سے تجاوز نہ کروں۔ تو اپنے بندہ پر کرم کر کے ضرور ایسا فرمایئے تو آپ نے اپنے دستخط خاص سے یہ تحریر فرمایا کہ سألت عن التوحید وھذا عنکم معزول اللہ تبارک وتعالیٰ واحد احد صمد لم یلد ولم یولد و لم یکن لہ کفوا احد۔ خالق لیس بمخلوق یخلق تبارک وتعالیٰ ما یشاء من الاجسام وغیر ذلک ویصور ما یشاء ولیس بمصور جل ثناءہ وتقدست اسماءہ وتعالیٰ ان یکون لہ شبہ ھو لا غیرہ۔ لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع العلیم۔ تو نے توحید کے معاملہ میں سوال کیا حالانکہ یہ بات تم لوگوں سے اٹھالی گئی ہے۔ یعنی اس قسم کے سوال کی تم کو تکلیف نہیں دی گئی ہے اللہ ایک ہے یکتا ہے بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اور نہ اُس کا کوئی ہمسر ہے۔ خالق ہے مخلوق نہیں ہے۔ جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے خواہ جسم والی چیز ہو یا بے جسم جس قسم کی چاہتا ہے صورت بناتا ہے اس کی کسی نے صورت نہیں بنائی۔ اُس کی تعریفیں بزرگ ہیں اور اُس کے نام مقدس ہیں اور اُس سے برتر ہے کہ اس کی کوئی شبیہ ہو سکے۔ بس وہی وہ ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی نہیں۔ اس کی مثل کوئی شے نہیں اور وہی سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ بعض روایات میں مروی ہے کہ فکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ (یا) سبعین

مسئلہ اور ایک حدیث میں مروی ہے کہ انما العبادۃ فی التفکرُ فی اللہ تعالیٰ۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عظمت و قدرت و حکمت خدا تعالیٰ میں غور کرنا اُس کی نعمتوں میں خوض و فکر کرنا کہ کس قدر اُس نے ہمیں اپنی نعمتیں مرحمت فرمائی ہیں جس سے اُس کی محبت دل میں پیدا ہو۔ اور شوق عبادت زیادہ ہو۔ بہت بہتر بلکہ عمدۂ عبادات یہی ہے چنانچہ حدیث میں مروی ہے کہ جناب امام زین العابدین علیہ السلام نماز تہجد کے لئے اُٹھے۔ اور مطہرہ وضو کے واسطے طلب کیا۔ جب پانی لینے کے لئے ظرف آب میں ہاتھ ڈالا تو آپ کی نظر آسمان پر پڑ گئی۔ اُس وقت ستاروں کا جگمگانا اور اُن کا ایک دوسرے سے متباعد متقارب نسبتیں رکھنا کچھ ایسا آپ کو بھلا معلوم ہوا کہ اُسی حالت سے ان ستاروں پر نظر فرماتے رہے یہاں تک کہ صبح صادق ہوگئی اور اذان کی آواز آئی۔ تو اس سے مقصد صرف یہی تھا۔ کہ آپ غور فرما رہے تھے۔ کہ سبحان اللہ کیسا وہ اقدر القادرین ہے۔ جس نے ایسے ایسے روشن اور مضئ بنفسہ ستارے پیدا کئے اور جن کو نہایت عمدہ اور باثر نسبتوں کے ساتھ ایک دوسرے کے متقابل میں قائم فرمایا۔ اور کیا کیا آثار ان پر مترتب فرمائے۔ اور کیا کیا عجائب حکمت ان سے ظاہر کئے اور چونکہ یہ فعل اعظم عبادات سے تھا۔ اس لئے اس میں غور فرماتے رہے۔ اور نماز تہجد کا بدل اس عبادت کو قرار دیا۔ فصلوات اللہ علیہ وعلی آبائہ الطاہرین وابنائہ المعصومین (۲۰)

خدا کی معرفت کیوں مشکل ہے

ہماری فطرت میں گو ایک خاص نشان کے طور پر کوئی ایسی قوت نہیں رکھی گئی جو بالخصوص خداشناسی کی قوت سے موسوم ہو اور نہ ہم اپنی ذات میں کوئی ایسی علامت خلقی طور پر پاتے ہیں جو ہمیں ایک خصوصیت کے ساتھ خدا کی ذات کا علم بطور ایک مخصوص نشان کے کرا سکتی ہو۔ باوجود اس کے بھی خدا نے اپنی ہستی کو بغیر نشان کے نہیں چھوڑا۔ ہمیں ایسی قوتیں بھی دی گئی ہیں جو رفتہ رفتہ ہمیں اس راہ پر لے جاتی ہیں جہاں سے خدا کی ہستی کا پتہ یقینی رنگ میں مل سکتا ہے۔ یعنی اگر ہم احساس۔ ادراک اور عقل و فراست سے کام لیں تو خدا کی ہستی کا بدیہی ثبوت ملنا مشکل نہیں۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیوں ہمیں قدرت نے ایسے صریح نشان سے محروم رکھا؟ کیا اس سے اس کا یہ منشاء تو نہیں کہ ہم اس کی تلاش کا خیال ہی چھوڑ دیں؟

میری رائے میں یہ بات نہیں۔ قدرت اس مرحلہ میں بھی اسی طریق پر چلی ہے جو دوسرے مراحل میں اس کا معمول ہے۔ اگر صریح طور پر فطرتِ انسانی میں خدا کی ذات کے علم کا کوئی مخصوص نشان رکھ دیا جاتا تو انسان اس چھان بین سے رہ جاتا جو اسے اب کرنی پڑتی ہے اور اس وجہ اس کی قوتیں کسی حد تک اس مرحلہ میں سست پڑ جاتیں۔ اور ہماری بصیرت اور عقل و فراست سرمایہ تجسس سے محروم رہ جاتی جو انسانی قوتوں کی ترقی اور عروج کا ایک فطرتی پیمانہ ہے۔ خدا کا علم بھی ایک

علم ہے۔ کوئی علم سوائے اس کے حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہیئے جو اداکی قوتوں کے کام میں لانے کے بغیر ہی صورت پذیر ہوتا ہو۔ ہم خدا کی ہستی سے واقف کئے گئے ہیں اور ہمیں وہ راہیں بتا دی گئی ہیں جو خدا تک پہنچاتی ہیں۔ مگر ہماری واقفیت اور وہ راہیں ایک پردہ میں رکھی گئی ہیں تاکہ ہم اپنی قوتوں اور اپنے آلاتِ احساسی سے خود بھی کام لینے کے قابل ہوں اور اس طریق سے ہمارا یقین ہدایت سے بھی زیادہ تر مضبوط اور مستقیم ہو سکے۔

قدرت نے ہمارے اردگرد ہی بلکہ خود ہماری ذات میں ہی کسی حد تک ایسے وسائل بہم پہنچا رکھے ہیں جن سے ہم خدا کی ہستی اور ذات کا یقینی پیرایہ میں اعتراف کر سکتے ہیں۔ جب ہم ان مختلف وسائل سے کام لیتے ہیں۔ تو ہم پر کھل جاتا ہے اور خود ہماری اپنی ذات بھی اس پر بوجوہ شاہد ہوتی ہے کہ ہم اس ذاتِ خدائی سے بہت دور نہیں ہیں۔ خود ہماری ہستی ہی بوجوہ اس پر شاہد ہے۔

اور یہ شہادت ہمارے مقابلہ میں ہندسی یقین کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پر بھی ہمیں لازم ہے کہ ہم دیگر طریق سے بھی اس صداقت کے معلوم کرنے کے لئے ساعی ہوں۔ لیکن سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ ہم شروع میں اپنی ہی ہستی کی شہادتوں سے اس پر روشنی ڈالیں اور دیکھیں کہ خود ہماری ہستی ہی کہاں تک اس راہ میں ہمیں مدد دینے کے قابل ہے (۱۹)

خدا کا تصوّر کیوں مشکل ہے

وجودِ باری۔ یہ مسئلہ آسان سے آسان اور مشکل سے مشکل ہے اس کی مثال بعینہٖ یہ ہے کہ آفتاب نہایت روشن ہے لیکن اس کی روشنی ہی اُس کا سبب بھی ہے کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی اور خفاش اُس کے دیکھنے سے عاجز آجاتا ہے۔ عقلِ انسانی کو بھی خدا کے ساتھ یہی نسبت ہے۔

انسان کے ادراک کی ابتداء حواسِ خمسہ سے شروع ہوتی ہے، وہ لامسہ، شامہ۔ ذائقہ۔ سامعہ۔ باصرہ سے اشیاء کا احساس کرتا ہے۔ اوّل اوّل وہ محض حس کا پابند رہتا ہے۔ یعنی جب تک کوئی مادی چیز اُس کے سامنے موجود رہتی ہے۔ اس کا ادراک کرتا ہے۔ پھر اس قدر ترقی کرتا ہے کہ اُس چیز کی صورت متخیلہ میں قائم ہو جاتی ہے، یہ مادہ سے تجرد کا پہلا درجہ ہے۔ پھر جزئیات سے کلیات قائم کرتا ہے کلیات اگرچہ مادہ سے بری ہوتی ہیں، لیکن چونکہ کلیات جزئیات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جزئیات کا علم، محض حواس کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا اثر توسط پر بھی باقی رہتا ہے

غرض چونکہ حواس کا توسط فطرت کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور تمام عمر باقی رہتا ہے اس لئے کسی ایسی شئے کا تعقل کرنا جو مجرد محض ہو۔ اور جس کے ادراک میں حواس کا واسطہ کہیں نہ پیش آئے سخت مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان خدا کا تعقل نہایت مشکل سے کر سکتا ہے، کیونکہ خدا مجرد محض ہے جس کو حواس سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔

اربابِ نظر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ادراکات کو حواس سے الگ کرتے جائیں اور صرف اُن چیزوں کا تصور کریں جو مادہ سے بریٰ ہیں، مثلاً کلیات۔ عقول۔ روح۔ ان معقولات کی تصور کی ممارست اور مزاولت سے رفتہ رفتہ یہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ مجرد محض کا تصور، امکان کی حد تک آجاتا ہے اور پھر ترقی ہوتے ہوتے اُس کا یقین ہوجاتا ہے۔

جزئیات اور کلیات میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جزئیات ہر وقت بدلتی رہتی ہیں اور اس وجہ سے ان کا علم بھی ہر وقت متغیر ہوتا رہتا ہے، مثلاً ایک شخص جو ہمارے سامنے بیٹھا ہوا ہے گو بظاہر ہم کو متغیر ہوتا نظر نہیں آتا لیکن اُس کے جسم کے اجزاء ہر وقت فنا ہوتے رہتے ہیں اور ان کے بجائے نئے اجزا پیدا ہوتے جاتے ہیں، اسی کو بدل ما یتحلل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر جزئیات کا علم کوئی مستقل اور پائدار علم نہیں، بلکہ ہر آن میں بدل جاتا ہے، بخلاف اس کے کلیات میں تغیر اور انقلاب نہیں ہوتا۔ زید۔ بکر۔ عمر کی انقلاب حالت سے نفس انسان کی حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں ہوتا اسی طرح جو چیز جس قدر مادہ سے بریٰ ہوگی۔ اسی قدر تغیر اور تبدل سے بری ہوگی اور اس بنا پر اس کا ادراک بھی تغیر اور تبدل سے بری ہوگا، اسی بنا پر کلیات کا علم، جزئیات کے علم سے زیادہ دیرپا اور اشرف و افضل ہے۔

ان مقدمات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خدا کا ادراک جس قدر طاقت بشری میں ہے وہ بھی اُن لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جنہوں نے محسوسات سے ترقی کر کے معقولات محض کے متعلق اس قدر غور و فکر سے کام لیا ہے کہ اُن کو اشیاء کے تصور کرنے کے لئے مادہ اور حواس کے توسط کی ضرورت نہیں پڑتی۔ (۵۶)

کیا خدا کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے؟

اب شاید کسی کے دل میں یہ خیال گذرے کہ جب وہ ایسی وراء الوراء ہستی ہے کہ جس کا کوئی پتہ ہی نہیں لگ سکتا تو پھر ہم اسے کس طرح سمجھ سکتے ہیں اور کیونکر اس کے وجود کو ذہن میں لا سکتے۔ اور اس کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی ذات اور حقیقت کو کوئی نہیں پا سکتا۔ کیونکہ جس چیز کی حقیقت کو کوئی پالیتا ہے۔ اس کو بنا بھی لیتا ہے اور ہمارا خدا کی حقیقت کو پالینے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم اُسے بنا بھی سکتے ہیں۔ مثلاً گھڑی ہے اس کے متعلق اگر کامل علم ہو اس کے پرزوں کی ساخت کا بھی اور ان کی ترکیب کا بھی اور اس سامان کا بھی جس سے وہ بنتی ہے اور جس طرح وہ بنتی ہے تو پھر اس کا بنانا بھی ہمارے لئے بالکل ممکن ہوگا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی حقیقت کو سمجھ لینے اور پالینے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم ایسا ویسا ہی خدا بنا بھی سکیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کو سمجھنا تو الگ رہا۔ ہم اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اور اس بات کو بچے بھی جانتے ہیں۔ چنانچہ بچے ایک کھیل کھیلا کرتے ہیں جس میں ایک دوسرے کو کہتا ہے کہ مجھ کو پکڑو جب دوسرا اس کے کسی عضو کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ تم نے مجھے تو نہیں پکڑا۔ میرے ہاتھ کو پکڑا ہے یا پاؤں کو پکڑا ہے یا سر کو پکڑا ہے اس کھیل کا بھی درحقیقت

یہی مطلب ہے کہ انسان کی حقیقت بھی پوشیدہ ہے صرف آثار ظاہر ہیں سارے فلاسفر اس بات کی تعیین کرنے کرتے مر گئے کہ میں کیا چیز ہے، مگر وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے پس جب انسان اپنے آپ کا پتہ نہیں لگا سکتے تو خدا کا پتہ کیا لگائیں گے، حدیث میں آتا ہے تفکروا فی ذات اللہ حمقی کہ خدا کی ذات کے متعلق تم سارے بالکل حیران و پریشان ہو۔ اس کی ذات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ (۸۰)

خدا کا پتہ کس طرح لگے گا؟

اب سوال ہوگا کہ پھر اس وراء الوریٰ ہستی کا پتہ کس طرح لگے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا پتہ الہام سے لگتا ہے۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار تم خدا تک نہیں پہنچ سکتے مگر اس پر گھبراؤ نہیں۔ ہم خود تمہارے پاس آئیں گے ایک بزرگ کا واقع لکھا ہے کہ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے پاس بادشاہ کا پروانہ آیا کہ جلدی آکر ہمیں فلاں جگہ پر ملو۔ اس پر ان کے دوست گھبرائے کہ کیا سبب ہے کہ بادشاہ نے اس طرح انہیں بلوایا ہے اور انہوں نے چاہا کہ وہ ابھی ٹھہریں۔ پہلے وہ پتہ لے لیں کہ کیا بات ہے مگر وہ چل پڑے شام کے قریب سخت بارش آئی اور اندھیرا ہو گیا۔ اور وہ ایک جھونپڑی میں جو جنگل میں تھی پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ وہاں جاکر انہوں نے صاحب مکان سے رات بسر کرنے کی اجازت طلب کی۔ جو شخص اندر تھا اس نے کہا آجاؤ۔ وہ اندر گئے۔ تو دیکھا کہ ایک اپاہج لیٹا ہے جب اس کو انہوں نے اپنا پتہ بتایا کہ میں فلاں ہوں۔ تو وہ رو پڑا۔ کہ میں مدت سے دعائیں کر رہا تھا کہ خدا مجھے آپ کی زیارت کرائے معلوم ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو میرے لئے ہی لایا ہے۔ وہ رات بھر وہاں رہے صبح دوسرا ہرکارہ آگیا۔ کہ آپ کو اب آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ واپس چلے جائیں اس سے اُن کو اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ ایک الٰہی تدبیر تھی۔

جس طرح وہ اپاہج جو چلنے پھرنے سے مجبور تھا اس بزرگ تک پہنچ گیا تھا۔ اسی طرح ہم جو خدا تعالےٰ تک پہنچنے کے معاملہ میں اپاہجوں سے بھی بدتر ہیں خدا تک نہ پہنچ سکتے ہیں یعنی وہ خود ہم تک آئے اور اپنے وجود کو ہم پر ظاہر فرمائے اور وہ ایسا ہی کرتا ہے اور اپنی ملاقات کے پیاسوں کو خود آکر اپنے شربت دیدار سے سیراب کرتا ہے (۸۰)

خدا کی معرفت کس طرح حاصل ہوگی؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا علم تو ہمیں الہام کے ذریعہ سے ہو جائے گا لیکن اس کی معرفت ہمیں کس ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ خالی علم اس تعلق کے لئے کافی نہیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان ہونا چاہیئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی معرفت کامل حاصل کرنے کے تین طریق ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس چیز کو پکڑ کر سامنے کر دیا جائے۔ اور دوسرا آدمی اسے خوب اچھی طرح ٹٹول ٹٹال کر دیکھ لے اور اس کی پوری معرفت پیدا کر لے۔ مثلاً ایک شخص کا نام سیف اللہ ہو۔ جس نے اس کو نہ دیکھا ہو۔ وہ اگر اس کی معرفت حاصل کرنا چاہے تو سیف اللہ کو پکڑ کر اس کے سامنے کر دیں گے۔ کہ وہ یہ شخص ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس چیز کی بناوٹ کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں میز اور کرسی کا اگر رواج نہ ہو اور اسی ملک کے لوگ برسبیل تذکرہ میز و کرسی کا نام سنیں تو ان کو واقف کرنے کے لئے یہ ذریعہ اختیار کیا جائے گا۔ کہ میز اور کرسی کی شکل اور بناوٹ اور ان کا کام تفصیل سے ان کو بتا دیا جائے گا اور اس سے ایک اندازہ ان کے ذہنوں میں میز اور کرسی کی نسبت پیدا ہو جائے گا۔ تیسرا طریق یہ ہے جو ان چیزوں کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے جو مرئی نہیں ہیں یہ ہے کہ ان کی صفات کے ذریعہ سے ان کی معرفت کرائی جاتی ہے۔ مثلاً نور ہے یہ ایسی چیز نہیں کہ اس کی بناوٹ بیان کر سکیں۔ اس لئے ایک اندھے کے سامنے اس کی صفات ہی بیان کی جائیں گی۔ اس کے ذریعہ سے آنکھ بغیر ٹٹولنے کے معلوم کر لیتی ہے کہ کسی چیز کی لمبائی کیا ہے چوڑائی کیا ہے اور اونچائی کیا ہے۔ رنگ کی کیفیت اندھا سمجھ نہیں سکتا) اس بیان سے اندھا کچھ نہ کچھ اندازہ کرے گا۔ اسی طرح اور کئی چیزیں ہیں کہ جن کی صفات بیان کرنے سے ان کا پتہ لگایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی شناخت بھی اسی طریق سے ہوتی ہے۔ وہ صفات ہی کے ذریعہ سے انسان کے سامنے آتا ہے۔ اور صفات ہی کے ذریعہ سے انسان اسے پہچان سکتا ہے۔ (۸۰)

غیر معروف خدا کو کیوں مانیں؟

انسان کے اس شک کو دور کرنے کے لئے کہ اگر میں خدا کو نہیں سمجھ سکتا اور اس کی حقیقت معلوم نہیں کر سکتا تو اس کے ماننے کا کیا فائدہ؟ خدا تعالیٰ نے ساری ہی حقیقتوں کو مخفی کر دیا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کی حقیقت کو بھی ہم نہیں معلوم کر سکتے۔ ایک میز کو لے لو ہم اس کی چوڑائی لمبائی اور رنگ دیکھتے ہیں۔ مگر کیا لمبائی چوڑائی اور رنگ کو میز کہتے ہیں؟ ہم ان چیزوں کو دیکھ کر ایک عرفان ایک وقوف اپنے ذہن میں پاتے ہیں اور وہ میز ہوتی ہے یا مثلاً کوئی شخص دوسرے کو اپنا بیٹا کہتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ کیا اس سے کہ وہ اتنا اونچا اور اس رنگ کا ہے۔ نہیں بلکہ اس کیفیت کی وجہ سے جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے غرض اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے کہ اگر خدا کی ذات مخفی ہی رہتی ہے۔ تو کیا پتہ لگ سکتا ہے کہ وہ ہے۔ اور کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ سب چیزوں کی حقیقت کو مخفی کر دیا ہے۔ (۸۰)

امام ابن تیمیہ اور تفکّر فی ذات اللہ

علامہ کے قیام مصر کے دوران ایک مرتبہ کسی شخص نے ان سے پوچھ لیا کہ مسائل کے ایسے گوشوں سے متعلق فکر و تعمق جائز ہے جن میں کہ شریعت کی تصریحات موجود نہ ہوں، اور اگر دین کے ایسے مسائل میں غور و فکر اور بحث و نظر کی کھلی اجازت ہے تو پھر ان احادیث کی کیا توجیہہ کی جائے گی، جن میں دینیات اور الٰہیات کے باریک مباحث سے متعلق غور و خوض سے روکا گیا ہے اس سوال کا موجب دراصل یہ غلط فہمی ہے کہ شریعت نے عقل و خرد کے دواعی سے روکا ہے، یا سلف نے 'علم الکلام' کی نازیبا خدمت کی ہے۔

علامہ نے پہلے تو اس مفروضے کی تردید کی ہے کہ شریعت کا کوئی مسئلہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جس کی وضاحت نہ کی گئی ہو۔ خصوصاً جو عمل و عقیدہ کے اعتبار سے ضروری ہو لیکن اس کے خدوخال کو نکھارا نہ گیا ہو۔ اس لئے کہ اگر کوئی مسئلہ دینی لحاظ سے اس درجہ اہم ہے کہ اس کا ماننا اور جاننا واجباتِ دین میں سے ہے تو اس کا نہ صرف قرآن میں ہونا ضروری ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی جملہ تفصیلات قرآن میں مذکور ہوں۔ یہی نہیں قرآن میں وہ دلائل، وہ براہین اور شواہد بھی پائے جانے چاہئیں۔ جن سے اس مسئلہ کی صحت و استواری پر پوری طرح روشنی پڑ سکے۔ جیسا کہ خود قرآن میں ہے۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (یوسف/۱۱۱)

قرآن ایسی بات نہیں جو آپنے دل سے بنائی گئی ہو۔ بلکہ جو کتابیں پہلے نازل ہوئی ہیں، یہ ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر چیز کی تفصیل بیان کرنے والا ہے، اور مومنوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔

علامہ کا موقف یہ ہے کہ اگر بنیادی مسائل کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مفصل و کافی نہ مانا جائے یا یہ فرض کیا جائے کہ آنحضرتؐ نے ان سے متعلق خاموشی اختیار کی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کھلے ہوئے تناقض کا شکار ہو گئے ہیں کیونکہ اس کا یہ مطلب یہ ہوگا۔

(۱) کہ یہ مسائل اگرچہ حد درجہ کی دینی اہمیت کے حامل تھے، اور شرح و بسط بھی چاہتے تھے، مگر اس کے باوجود قرآن و سنت نے ان کو درخور اعتنا قرار نہیں دیا اور

(۲) یا شریعت نے ان کی پوری پوری وضاحت تو کی تھی لیکن یہ وضاحت بعض اسباب کی بنا پر ہم تک منتقل نہیں ہو پائی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔[1]

[1] موافقۃ صحیح المنقول لصریح المعقول، علامہ ابن تیمیہ، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ، مدینہ، ج ۱ ص ۱۰ تا ۱۲

اس کے بعد اس حقیقت کی پردہ کشائی فرمائی کہ دینی مسائل میں غور و خوض نہ صرف جائز، برمحل اور موزوں ہے بلکہ قرآن کا تو طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس نے جب بھی کسی دینی حقیقت کو پیش کیا ہے تو اس طرح مدلل و مبرہن طور سے کہ انکار کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

ان کی رائے میں عقل و خرد کی ضیا افروزیوں سے بہرہ مند نہ ہونا مسلمانوں کا شیوہ نہیں، کفار کی محرومی اور تہیدستی ہے وہی حشر کے روز کفِ افسوس ملیں گے اور کہیں گے۔

لَوۡ كُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا كُنَّا فِيۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ۔ (الملک - ۱۰)

اگر ہم پیغمبر کی دعوت پر کان دھرتے اور سوجھ سمجھ سے کام لیتے تو آج دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

نظریۂ تفویض اور تکافؤ ادلہ کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں

علامہ کے نزدیک عقل و خرد کا کیا درجہ ہے، اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ ان کے نزدیک قلب و ذہن میں عقائد و تصورات کا نقشہ، صاف، ممیز اور واضح ہونا چاہیئے اور اس باب میں تفویض اور تکافؤ ادلہ کی آڑ لینا ہرگز جائز نہیں، قرآن و سنت کی ہدایات واضح ہیں، فہم و ادراک کے فیصلے متعین ہیں، خود شریعت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جچی تلی اور واضح رائے عقائد سے متعلق قائم کی جائے کیونکہ اگر ایمانیات ہی کی بنیاد قطعیت، اثبات اور وضاحت پر نہیں ہوگی۔ تو اس سے کسی محکم و واضح تر کردار و سیرت کی تشکیل کی آرزو کرنے سے محال ہے۔

تفویض کے یہ معنی ہیں کہ الفاظِ قرآن کو بغیر کسی مدلول کو متعین کیے اور تعبیر و وضاحت کی تحدید کے مانا جائے اور کہا جائے کہ مدلول و معنی کو سوا اللہ کی ذات کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس موقف کے مقابلہ میں علامہ کا کہنا ہے

اما التفویض فمن المعلوم ان اللّٰہ تعالیٰ امرنا ان نتدبر القراٰن۔ وحضنا علی عقلہ وفہمہ فکیف یجوز مع ذلک۔

سو جہاں تک تفویض کا تعلق ہے یہ بات جانی بوجھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تدبر قرآن کی دعوت دی ہے اور ہمیں اس کے فہم ادراک پر ابھارا ہے اور آمادہ کیا ہے۔ اس بنا پر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم سے وہ اس بات کا بھی خواہاں ہو کہ اس کے فہم و ادراک سے پہلو تہی کریں، اس کی معرفت سے کنارہ کش ہوں اور اس میں تعقل و تعمق کی خو نہ ڈالیں۔

تکافؤ ادلہ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک عقلی دلائل کا تعلق ہے، ان کے ذریعہ حق و باطل کا قطعی فیصلہ کرنا ممکن نہیں کیونکہ اگر ایک دلیل ایک حقیقت کے اثبات پر زور دیتی اور اس کو حق بجانب ٹھہراتی ہے تو

دوسری دلیل اسی حقیقت کو اُسی قوت کے ساتھ باطل قرار دے سکتی ہے۔ یعنی عقلیات کی درماندگی کا یہ حال ہے کہ جس کو عقل وخرد کے بل پر ثابت کیا جائے گا، اُسی کو عقل وخرد کی بنیاد پر جھٹلایا بھی جاسکتا ہے۔ امام ابوالحسن اشعری نے اسی دلیل سے متاثر ہو کر یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ عقائد میں صرف نصوص ہی پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ کیونکہ عقل وخرد کی شعبدہ طرازیوں کا کیا اعتبار ہے۔ ابھی حق کے ساتھ ہیں اور ابھی باطل کی تائید ومعاونت میں سرگرم![1]

علامہ اگرچہ عقل وخرد کی نارسائیوں کو مانتے ہیں، اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تنہا عقل کی روشنی سے ایمان وعقائد کی گتھیوں کو سلجھانا ممکن نہیں (اور بالخصوص یونانی فکر تو اس سلسلہ میں قطعی مایوس کن ہے) تاہم وہ اس مؤقف کو ماننے کے لئے بھی تیار نہیں کہ دلائل حق وباطل اور نفی واثبات کے دوگونہ احتمالات کی پرورش کرنے والے ہیں۔ یہ مؤقف ان کے نزدیک کھلا ہوا تناقض لئے ہوئے ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ہی شئے عقلی لحاظ سے صحیح بھی ہو اور غلط بھی ہو۔ ہدایت بھی مشتمل ہو اور گمراہی پر بھی، اسی طرح کسی نتیجے کے اثبات پر بھی دلالت کناں ہو اور اس کی نفی اور ابطال کو بھی مستلزم ہو۔

علامہ کا کہنا ہے، قرآن کے بارہ میں جس اختلاف کثیر کی نفی کی گئی ہے اور جس کو کلام الٰہی کے منافی ٹھہرایا گیا ہے، وہ یہی تناقض اور دلائل و براہین کا اختلاف تو ہے۔

افلا یتدبرون القراٰن ولو کان من عند غیر اللّٰہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (النساء ۸۲)

بھلا یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

ان کے نزدیک تکافؤ ادلہ کا گھپلا اس وقت ابھرتا ہے جب دلیل میں کہیں بگاڑ پایا جائے۔[2] اسی وجہ سے قرآن نے یکسائی اور وحدتِ فکر کے بجائے اختلاف وتناقض اور فریب استدلال کو کفار مکہ کی جانب منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے پاس کوئی بھی تو سلجھی ہوئی اور متفق علیہ اساس نہیں ہے جس پر یہ اپنے افکار کی تعمیر کرسکیں۔[3]

اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ یُّؤْفَکُ عَنْہُ مَنْ اُفِکَ ۔ (الذاریات ۸)

اے اہل مکہ تم ایک متناقض بات میں پڑے ہوئے ہو (اور) حقائق سے وہی روگردانی اختیار کرتا ہے۔ جس سے توفیق ہدایت چھین لی گئی ہو۔

قرآن میں ممنوع غور وفکر نہیں، جہل وغلط روی ہے

---

[1] موافقہ صحیح المنقول، ج ۱، ص ۱۱۹ [2] یہی ماخذ ج ۱، ص ۱۶۶ [3] یہی ماخذ اور یہی سیاق وصفحہ

سوال یہ ہے کہ اگر دینیات میں فکر و تدبر ضروری ہے تو پھر قرآن نے، سنت نے، اور سلف نے رد کا کس چیز سے ہے؟

جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے، اس نے جن باتوں سے منع کیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) قول بلا علم ـــ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (الاعراف - ۳۳)

اور اس کو بھی حرام ٹھہرایا ہے کہ خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہو کہ جن کا تمہیں کوئی علم نہیں۔

(۲) غیر حقیقی باتوں کو اللہ کی طرف منسوب کرنا۔

اَنْ لَا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ - (الاعراف / ۱۶۹)

یہ کہ حق کے سوا اللہ کی طرف کوئی چیز منسوب نہیں کریں گے۔

(۳) بغیر کچھ جانے بوجھے، اور حق و صداقت کا احاطہ کیے، جدل و بحث کے طوفان اٹھانا۔

هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ (آل عمران ۶۶)

دیکھو اس بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا جس کا تمہیں تھوڑا بہت علم تھا بھی۔ مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو کچھ علم نہیں۔

(۴) حق و صداقت کے آشکار ہو جانے کے بعد بھی مین میخ نکالنا اور بحث و مناظرہ کا جاری رکھنا۔

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ (انفال ۶)

حق کے آشکار ہو جانے پر بھی یہ لوگ تم سے جھگڑنے لگے۔

(۵) غلط دلائل سے کام لینا

يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ - الکہف - ۵۶)

اور کافر باطل کی بنیاد پر جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو پھسلا دیں

یہی وہ باتیں ہیں جن سے ایک شخص جادۂ مستقیم کو چھوڑ کر گمراہی کے آغوش میں جاگرتا ہے[1]

سنت و احادیث میں بھی فکر و تعمق نہیں رد کیا گیا بلکہ صرف موجباتِ اختلاف کی روک تھام کی گئی ہے۔

سنت میں بھی نظر و اجتہاد، یا بصیرت و تعمق کے شرعی و دینی تقاضوں سے کہیں نہیں رد کیا گیا ہے، اور نہ دین کے بنیادی مسائل میں فہم و ادراک سے کہیں باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس چیز سے ہمیں روکا اور منع کیا

---

[1] مواقع نہی کی نشاندہی کے لئے دیکھیے موافقہ صحیح المنقول ج ۱، ص ۲۵۔

گیا ہے وہ اختلاف وتشتت کی مہلک بیماری ہے۔ قرآن کی آیات کو آپس میں بھڑانا، اور مواقع اختلاف تلاش کرنا ہے اور اس طرح اختلاف وتشتت سے سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں خواہ مخواہ کی بحث وجدل سے شکوک پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب صحابہ میں بعض حضرات نے قضا وقدر پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن کی آیات کو باہم بھڑانا شروع کیا، اور نظر وفکر کے اختلافات کو ابھارنے کی سعی کی تو آپؐ کا مارے غصہ کے چہرہ انار کی طرح سرخ ہوگیا۔ آپ نے فرمایا:-

ابھذا امرتم؟ انما ھلک من کان قبلکم بھذا ضربوا کتاب اللہ بعضہ ببعض وانما نزل کتاب اللہ یصدق بعضہ بعضًا۔ (۲)

کیا تمہیں اس چیز کا حکم دیا گیا ہے۔ سن رکھو کہ پہلی قومیں اسی خوئے جدال کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ یہ اللہ کی کتاب میں تعارض وتناقض کے پہلوؤں کی تلاش میں رہتی تھیں۔ حالانکہ پوری کتاب ایک سچائی ہے جس کی تمام کڑیاں صداقت کی ایک مضبوط زنجیر کی مانند ہیں کہ اس کا ہر حصہ باقی حصص کا مصداق اور مؤید ہے۔ (۵۴)

معرفت خدا کا آسان ترین طریقہ

بہترین اشیاء عالم علم ہے اور بہترین علوم علم المعرفت۔ یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وصفات وکمال وجمال وجلال کی معرفت بقدر امکان طاقت بشریہ حاصل کرنی۔ یہی غایت وجود انسان ہے۔ اور یہی نتیجہ عمر بشر۔ اگر انسان ایک طولانی مدت تک دنیا میں زندہ رہا۔ اور اُس نے خدا تعالےٰ کی معرفت حاصل نہ کی۔ تو اُس سے بڑا کوئی گناہ گار نہیں۔ کیونکہ جس کی نعمتوں میں زندگی بھر اُٹھتا۔ بیٹھتا۔ سوتا جاگتا۔ کھاتا۔ پیتا۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ جس کی نعمتیں تمام عمر اُس کا اوڑھنا بچھونا رہیں۔ ایک ہلکا سا سانس بھی جس کی نعمت سے علیحدہ نہ لے سکا۔ ایک خفیف سی حرکت بھی جس کی نعمت سے باہر نہ کر سکا ایک پلک بھی بغیر جس کی نعمت کے نہ مار سکا۔ ایک قدم بھی جس کی نعمت سے الگ نہ اٹھا سکا اور ایک خیال بھی بغیر جس کی نعمت کے نہ دوڑا سکا۔ اگر اسی کی معرفت نہ حاصل کی۔ تو کیا ایسے محسن کش احسان فراموش ناشکرے خود غرض کمینہ فطرت سے زیادہ کوئی قابل نفرت ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر اگر خود وہی محسن ومنعم اپنی معرفت کے اسباب بھی پیدا کر دے۔ دلیلیں بھی قائم فرما دے۔ راہنما بھی بھیج دے۔ نرم سے نرم اور ہلکے سے ہلکے اور سہل سے سہل لفظوں اور دلچسپ سے دلچسپ لہجوں میں ہدایت بھی کر دے۔ تب بھی اگر کوئی شخص اس کی معرفت حاصل کرنے کا ارادہ نہ کرے تو یقیناً انسانی خیال اس کی انتہائی قعر ذلت وخسران تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ اُس کی کمینہ فطرتی کے عمق تک کوئی عمیق فکر جا سکتی ہے۔

پس ہر انسان عاقل کا فرض ہو کہ اپنے معتد بہ وقت اس کام میں صرف کرے اور جس طرح ہو سکے دلیل وتحقیق کی رو سے اس کی معرفت حاصل کرے۔ رہی یہ بات کہ وہ دلیل یا تحقیق کہاں سے لینی چاہیئے، تو اس کے دو مقام ہیں ایک عقل ہے اور دوسری نقل۔ لیکن اگرچہ عقل مقدم ہے۔ پھر بھی ہر شخص میں اتنی دماغی قوت اور ذہنی طاقت نہیں ہے کہ بجائے خود ہر ہر مرحلہ علم المعرفت تک بغیر کسی راہنما کے پہنچ سکے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اس معاملہ میں کسی کو اپنا راہبر بنائے۔ لیکن یہ سوال کہ آخر کس کو راہنما بنائے اس کا جواب صرف اسی قدر کافی ہے کہ اگر تلاش کرنے سے خود اُسی کی بنائی ہوئی دلیلیں اور اُسی کے عقلی ارشادات مل جائیں۔ اور اُن ارشادات کی تشریحیں اُسی کے بھیجے ہوئے اور مقرر کئے ہوئے معلموں سے مل سکیں۔ تو اُس سے بہتر کیا بات ہے۔ مگر یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس کے ارشادات اس کی ہدائتیں اور عقلی تعلیم کہاں سے ہاتھ آئیں اور کیونکر یہ یقین ہو کہ یہ تعلیمیں واقعی اسی کی ہیں کیونکہ اہل دُنیا نے تو اس معاملہ میں سخت اختلاف آپس میں پیدا کر رکھا ہے۔ حضرات اہل اسلام فرماتے ہیں کہ اُس کی تعلیمیں قرآن مجید سے مل سکتی ہیں۔ آریہ دھرم اور برہمو سماج فرماتے ہیں کہ اس کا مخزن وید کے چار مجلدات ہیں۔ رگوید۔ یجروید۔ اتھروید۔ شام وید۔ بودھ مذہب کے لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ بودھ جی کی کتابیں اس کا معدن ہیں۔ پارسی صاحبان کا مقولہ ہے کہ زردشت نبی کی کتاب اس کے لئے اچھا ذخیرہ ہے۔ مسیحی حضرات کا یہ قول ہے کہ انجیل مقدس اس کی کان ہے۔ یہودی لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ توریت مقدس یا طالمود سے بہتر کوئی کلام نہیں۔ جس سے اس معاملہ میں سبق لیا جائے۔ اور ہر ایک فریق دوسرے فریق کی بنائی ہوئی کتاب کو غلط کہتا ہے۔ ہندو صاحبان قرآن کو۔ مسلمان صاحبان وید کو۔ پارسی انجیل و توریت کو۔ عیسائی ژند یا زند اور دساتیر کو۔ علی ھذا القیاس ہر ایک دوسرے کو غلطی پر سمجھتا ہے پھر ایک ابتدائی جستجو کرنے والے کو ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیئے اور کیونکر اُسے کسی ایک کی نسبت رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے؟

بے شک یہ سوال ایک حد تک قابلِ غور ہے لیکن ذرا تامل کرنے سے اِس کا جواب خود بخود یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب کسی ایک امر کے ثبوت کے بعد اس کے انداز و طرق و شان و قوع میں اختلاف ہو تو اس سے اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ اصل امر تو واقع ہے لیکن چونکہ بیانات اُس کی نسبت مختلف ہیں لہٰذا بجائے خود اُن بیانات پر عقل کی گہری نظر سے غور کرنا چاہیئے کہ حقیقت کا زرین لباس اور واقعیت کا مرصع تاج۔ اور راستی کا گوہر آگین خلعت کس کے جسم و سر پہ دکھائی دیتا ہے چونکہ عقل ہی تمام امور میں فیصلہ کرنے کے لئے قدرتی قاضی بنائی گئی ہے۔ اس لئے وہ بہت تھوڑے سے تامل میں اس کا فیصلہ کر سکے گی اور چونکہ ایسے قاضی کے فیصلے پر تمام کاموں کا مدار رہی قرار پایا ہے لہٰذا جو کچھ وہ کہے اُسے تسلیم کرنا چاہیئے بشرطیکہ اس نے تامل کے طریقوں میں غلطی نہ کی ہو (اس کی تمیز بھی وہ خود ہی کرے گی جبکہ مقررہ موازین پر اپنے خیالات کو تولے گی)

لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ وہ ان تمام دعوؤں کو پیش نظر کرے اس کے بعد ہر ایک کو بالمقابلہ جانچے

جو عقل صحیح کے نزدیک درست معلوم ہو۔ اُسے قبول کرے۔ (مت ۳۰)

معرفت توحید معلّم توحید سے حاصل ہوگی

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ حقیقی اور صحیح معرفت و عبادت کیونکر اور کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہاں چند اصول کے بیان کی ضرورت ہے۔

اوّل یہ کہ مشاہدہ و تاریخ ادیانات و مذاہب و ملل شہادت دیتے ہیں کہ باوجودیکہ انسان میں خدا رسی کی فطری طلب موجود ہے اور ہر ایک مذہب والا اسی تلاش میں ہے علماء اپنے مدارس میں، صلحاء و عباد اپنے معابد میں۔ صوفیہ اپنے کنج تنہائی اور گوشۂ عزلت میں۔ مسلمان اپنے مساجد میں۔ ہندو اپنے مندروں میں آریہ اپنے سماجوں میں۔ سکھ اپنے گوردواروں میں۔ عیسائی اپنے گرجاؤں میں۔ علماء یہود اپنے صومعوں میں اسی فکر اور اسی تلاش میں ہیں مگر تلاش باقی ہے اور منزلِ مقصود پر نہیں پہنچے اور ان کے خیالات۔ اعتقادات۔ مذہبی رسومات کا اختلاف بتا رہا ہے کہ یہ سب ہرگز خدا رسیدہ نہیں ہیں یا تو ان مذاہب میں کوئی بھی خدا رسیدہ نہیں۔ یا بعض خدا رسیدہ ہیں اور بعض خدا رسیدہ نہیں لیکن چونکہ مسلّم ہے کہ دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم ایک ہی ہو سکتا ہے باقی جتنے ہوں گے سب کج اور ٹیڑھے ہوں گے۔ لہٰذا نقطِ عبودیت سے مرکزِ معبودیت تک حقیقی صراط مستقیم ایک ہی ہو سکتی ہے دو نہیں ہو سکتے ہیں۔ اِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ۔ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ بے شک یہی ایک میری صراط مستقیم ہے تم سب اسی کی پیروی کرو اور اس پر چلو اس کے بغیر مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ یعنی راہ شریعت و صراط مستقیم تکلیفی ایک ہی ہے وَلَوْ كَانَتِ الطُّرُقُ إِلَى اللهِ بِعَدَدِ أَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ فِي عِبَادَةِ التَّكْوِيْنِيَّةِ۔ فتامل فیہ۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ ان مذاہب مختلفہ عالم میں سے جن کے اعتقادات و خیالات و اصول دین میں صریح تناقص و تضاد موجود ہے اور اسی بنا پر ایک دوسرے کو ناحق پرست اور باطل کہہ رہا ہے صرف ایک ہی دین و مذہب۔ محکم۔ حق اور درست ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اجتماع نقیضین کل حکما کے نزدیک محال ہے اور حکماء اور میزانیین کے نزدیک مسلّم ہے کہ حَقِيْقَةُ الشَّيْءِ لَا يَكُوْنُ إِلَّا وَاحِدًا۔ ایک شے کی حقیقت ایک ہی ہو سکتی ہے دو نہیں ہو سکتی ہیں۔ پس حقیقتِ دین اور صراطِ مستقیم بھی ایک ہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا غور طلب مقام یہ ہے کہ باوجود طلب۔ سارے انسان کیوں حق پر نہ پہنچے۔ کیوں خدا رسیدہ نہ ہوئے۔ کیوں سب کو صراط مستقیم نہ ملی؟ کیوں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ کیوں ایک دوسرے کو تکفیر کرتے ہیں۔

کیوں ایک دوسرے کی عبادت و معرفت کو ناقص یا باطل کہتے ہیں حالانکہ ہر ایک خدا کا قائل اور اپنے خیال میں خدا ہی کی عبادت کرتا ہے خواہ کسی طریقہ پر ہو۔ اور عقلاء کا مقولہ ہے کہ عقلِ صحیح کا حکم ہمیشہ یکساں ہوا کرتا ہے۔ دو صحیح و سالم عقلیں کبھی اختلاف نہیں کرسکتی ہیں جب تک کہ کوئی امر مانع نہ ہوجائے۔ اَلعَقلُ یَجرِیْ عَلٰی طَرِیْقَۃٍ وَّاحِدَۃٍ ایک سلیم و صحیح عقل ہمیشہ ایک ہی راستہ پر چلتی ہے۔ اور خلقت اوّلی کے لحاظ سے تمام انسان یکساں ہیں ایک آدم کی اولاد ہیں ایک خالق کی مخلوق ہیں وَکَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً سارے انسان خلقت کے لحاظ سے ایک ہی اُمت تھے۔ پس یہ اختلاف کیوں ہوا؟ پھر یہ جنگِ مذاہب کیسی؟ یہاں ضرور کوئی راز ہے اور اسی راز کا پتہ لگانا ہے۔

دوئم انسان باتفاق عقلاء مجموعہ ہے جسم و روح کا اور روح انسان حکماء و فلاسفرز کے نزدیک مجرّد شے ہے۔ مادی نہیں ہے اور حکماء کہتے ہیں کہ تجرّد دلیل علم ہے۔ جو شے مجرد ہے وہ اپنے مرتبہ ذات میں ضرور عالم ہونی چاہیئے۔ روح کے لئے جہالتِ مطلقہ محال ہے جبکہ محققین فلاسفرز ثابت کرتے ہیں اَلْخَیْرُ لَا یَصْدِرُ عَنْہُ اِلَّا الْخَیْرُ خیر سے خیر ہی صادر ہوتا ہے اور جہالت شر ہے کیونکہ صفتِ عدمی ہے اور علم خیر ہے کیونکہ صفت وجودی ہے پس روح از روئے خلقت جاہل مطلق نہیں ہوسکتی ورنہ اس کی خلقت خلقت شری ہے اور یہ محال ہے کیونکہ خالق خیر محض ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا بچہ ماں کے پیٹ سے تفصیل معارف سے جاہل پیدا ہوتا ہے۔ نہ عالم نہ علم دینی کا عالم ہوتا ہے نہ علم دنیوی کا روحِ انسانی کی یہ جہالت کہاں سے آئی؟ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا۔ وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ اللہ نے تمہیں شکم مادر سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لئے کان۔ آنکھیں اور دل دیئے کہ ان سے علم حاصل کرو اس سے ثابت اور معلوم ہوا کہ انسان محتاج تحصیل علوم ہے اور محتاج علم ہے تو معلّم کی ضرورت ہے بغیر معلّم تعلیم کیونکر ہوگی؟ اور نوعِ انسان بحیثیت مجموعی کل کی کل اس احتیاج میں شریک ہے پھر اس کا معلم کون ہوگا درآنحالیکہ اس سے بالا کوئی مخلوق نہیں ہے اور کوئی نوع اُس سے افضل و اشرف نہیں ہے اور مکنونات ارضیہ میں سے کوئی نوع اس سے بالاموجود نہیں ہے اور جب مطلق تعلیم میں یہ محتاج معلّم ہے تو علم معارف اور معرفت خدا میں بدرجہ اولیٰ محتاج محض معلّم ہے بلکہ کلیتاً ظہور کمال انسان تعلیم ہی پر موقوف ہے اگر انسان کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو وہ ایک مضغہ گوشت سے زیادہ نہیں ہوسکتا ہے۔ ادنیٰ ترین حیوانات سے نہیں بڑھ سکتا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ جاہل تو مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔

پس صحیح معرفتِ خدا و صحیح عبادت خدا کیلئے تعلیم کی ضرورت ہے اور کسی معلم توحید کی احتیاج ہے اور حق یہ ہے کہ معرفت وہی درست کہلا سکتی ہے جو خدا کی تعلیم کردہ ہو اور وہی عبادت درست ہو سکتی ہے جو اس کی بتلائی ہوئی ہو اپنی اپنی عقل سے خدا کی صحیح و حقیقی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی جو خدا محض ناقص عقل سے پہچانا گیا ہے خدا نہیں بلکہ ہمارا تصور ذہنی خیالی مجسمہ ہے ۔ جو عبادت کہ ہماری خود ساختہ ہے وہ عبادتِ خدا نہیں ہمارے نفس کی عبادت ہے ۔ "اَرَءَیْتَ الَّذِی اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ"

جو صرف اپنی رائے اور اپنی خواہش پر چلتا ہے وہ خدا پرست نہیں ہے مشرک ہے ۔ اگر ہر ایک عبادت صحیح اور شایان شانِ الٰہی ہوتی تو عقلاء روزگار ایک دوسرے کی عبادت پر نکتہ چینی نہ کرتے اور ایک مذہب کے علماء دوسرے مذہب کی عبادت کو باطل نہ جانتے ۔ مگر مشاہدہ یہی بتلاتا ہے کہ ایک مذہب کے عقلاء، علماء، حکماء دوسرے کی عبادت کو غلط ۔ باطل یا ناقص کہتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل یہی حکم لگاتی ہے بلکہ ان کی فطرت یہ بتلاتی ہے کہ عبادت صحیح وہی ہے جو اس معبودِ برحق کی ذات کے لائق ہو اس کے حکم کے مطابق ہو اس کے منشا کے موافق ہو ورنہ بلاشبہ غلط و باطل یا ناقص ہے اور وہ کبھی پسندیدہ خدا نہیں ہو سکتی اور ایسی عبادت سے انسان کو اصلی فائدہ ہرگز نہیں ہو سکتا ۔

سوئم انسان حادث ہے ۔ خدا قدیم ہے ۔ انسان ممکن ہے وہ واجب الوجود ہے ۔ انسان بحیثیت ترکیب مادی ہے اور آلات جسمانیہ سے تحصیل علم کرتا ہے ۔ وہ ذات پاک مجردِ محض ۔ بسیطِ بحث ہے حکماء کا اتفاق ہے کہ اس کی حقیقت کا تصور محال ہے ۔ اسکی حقیقت و ماہیت کا علم نہیں ہو سکتا یعنی ہماری عقول ناقص ہیں ۔ ہمارے اعضاء و آلات احساس و ادراک ضعیف ہیں ۔ ہماری مثال نور الانور ذات کے مقابل میں آفتاب اور چمگادڑ کی سی ہے کہ چمگادڑ آنکھ کے ضعف اور نقص بصارت کی وجہ سے آفتاب کو نہیں دیکھ سکتی ۔ یہی حال ہماری عقول کا ہے اور یہی اک سبب معرفت خدا میں اختلافِ عقلاء کا ہے کہ ہر ایک نے جو کچھ سمجھا کہا ان کی مثال بالکل ان اندھوں کی سی ہے جو ہاتھی کی تحقیق کو نکلے تھے کہ دیکھیں ہاتھی کیسا ہوتا ہے ۔ خصوصاً وہ عقلاء جو مذہب کے پابند یا قائل نہیں ہیں معلوم ہوا کہ محض اپنی عقلِ ناقص اور ان آلات و اعضاء و قویٰ احساس و ادراک کے ذریعہ خدا کی صحیح معرفت کا حاصل ہونا محال ہے ۔

پاکی از آنچہ عاقلاں گفتند
پاک تر زانچہ غافلاں گفتند

اسی واسطے عارفین نے فرمایا ہے کہ ذَاتُ اللّٰہِ مُحْتَجِبَۃٌ مِنْ فَرْطِ نُوْرِہٖ کہ ذاتِ خداوندی منتہائے نورانیت کی وجہ سے حجاب میں ہے وَاسْتَتَرَ بِشُعَاعِ نُوْرِہٖ عَنْ نَوَاظِرِ خَلْقِہٖ اور اپنے نور کے شعاع کی وجہ سے مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ ہے ۔ چشم بصری اور چشم بصیرتی دونوں اس

کے ادراک سے قاصر ہیں۔ اور فلاسفرز کا اتفاق ہے کہ اَلْمُدْرِکُ لَابُدَّ اَنْ یَّکُوْنَ مِنْ سِنْخِ الْمُدْرَکِ ہر ایک شے اپنے جنس اور اپنی اصل کو ادراک کر سکتی ہے جس قسم کا مدرک (جس کو ادراک و دریافت کرتا ہے) ہو اسی سنخ کا مدرک (ادراک و دریافت کرنے والا) بھی ہونا چاہیئے مثلاً نور کو نورانی ہی ادراک کر سکتا ہے۔ پس مخلوق خود بخود اس کو ادراک نہیں کر سکتی حضرت رب العالمین علی بن ابی طالب امیر المومنین ارشاد فرماتے ہیں لَایُدْرِکُہٗ بُعْدُ الْھِمَمِ وَلَا یَنَالُہٗ غَوْصُ الْفِطَنِ ہمارے ارادے اور ہماری ہمتیں اس تک نہیں پہنچ سکتیں اور انسانی عقلیں اس سمندر میں غوطہ لگا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتی ہیں لَا یُحِیْطُہُ الْاَبْصَارُ وَالْقُلُوْبُ آنکھیں اور دل دونوں اس کا احاطہ نہیں کر سکتے وَلَا تَقَعُ الْاَوْھَامُ لَہٗ عَلٰی صِفَۃٍ وَلَا تَعْقِدُ الْقُلُوْبُ مِنْہُ عَلٰی کَیْفِیَّۃٍ ہمارے وہم اس کی کسی صفت کو خود بخود نہیں پا سکتے اور دل اس کی کسی کیفیت تک نہیں پہنچ سکتے فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمَعْرُوْفِ مِنْ غَیْرِ رُؤْیَۃٍ وَالْخَالِقِ مِنْ غَیْرِ رَوِیَّۃٍ وہی خدا مستحق حمد و ثنا ہے جو بغیر دیکھے پہچانا گیا ہے اور وہ بغیر سوچے اور غور و فکر کئے خلق کرتا ہے اور وہ خود ارشاد فرماتا ہے لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ" بصارتیں اور بصیرتیں اس کو خود ادراک نہیں کر سکتی ہیں اور وہ سب کو ادراک کرتا ہے اور وہ لطیف ہے جہاں ہم کثیفوں کی رسائی نہیں وہ خبیر ہے کہ سب کچھ جانتا ہے خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ وغیر ذلک من الاحادیث والآیات۔ اور اسی واسطے محمد بن علی بن الحسینؑ نے فرمایا ہے کہ کُلَّمَا مَیَّزْتُمُوْہُ بِاَوْھَامِکُمْ فِیْ اَدَقِّ مَعَانِیْہِ فَھُوَ مَخْلُوْقٌ لَکُمْ مَصْنُوْعٌ مِثْلُکُمْ مَرْدُوْدٌ اِلَیْکُمْ یعنی چونکہ ہماری عقول ناقصہ کُنہِ ذات خداوندی کا ادراک نہیں کر سکتی ہیں فرماتے ہیں کہ وہ ہر ایک دقیق ترین معانی جن کے ساتھ ان کو تم وہموں اور خیالوں سے ممتاز کر دگے اور ذہن میں اپنے وہم و خیال سے خدا کی ذات کا تصور قائم کر دگے کہ ایسا ایسا ہوتا ہے تو وہ خدائے خالق نہ ہوگا بلکہ وہ تمہارا خلق کردہ خدا ہوگا اور تم جیسا مصنوع ہوگا اور تمہاری طرف مردود ہوگا اور تمہیں ہی واپس کر دیا جائے گا۔ اپنے ذہنوں سے جو خدا بناؤ گے وہ خود ساختہ خدا ہوگا اور تمہارا ایک ذہنی بت ہے اور یہ صریحی شرک ہے۔

چہارم۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدائے معرفت بس خدا ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ عقل زیادہ سے زیادہ اگر رسائی پا سکتی ہے تو صرف اسی قدر کہ وہ ہے لیکن یہ معلوم کرنا کہ وہ کیا ہے اور اس کی تمام صفات کو جو اس کے شایان شان ہیں جاننا محال ہے اور ان تمام صفات کو جن سے اس کی ذات پاک ہے اور وہ اس کے لائق نہیں ہیں پہچاننا محال ہے ان صفات سے اس کو منزہ سمجھنا جو اس معبود کے مناسب و لائق نہیں ہیں تسبیح کہلاتی ہے اور ان صفات سے متصف سمجھنا جو اس معبود کے مناسب و شایان ہیں مگر ان صفات کو ذات سے علیحدہ اور زیادہ

سمجھ کر نہیں بلکہ عین ذات کو اِن کا منشاء سمجھ کر تحمید کہلاتی ہے اور تسبیح و تحمید کی تکمیل توحید و معرفت و اعتقاد الٰہی کی تکمیل ہے وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ۔ ہر ایک مخلوق اس کی فطری تسبیح یا تحمید کرتی ہے لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ تم بھی اس کی تسبیح بالحمد کرو فَسُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِهٖ وَسُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى وَبِحَمْدِهٖ۔ ہمارے چھٹے پیشوائے دین صادقِ آلِ محمدؐ ارشاد فرماتے ہیں اَعْرِفُوا اللّٰهَ بِاللّٰهِ اللہ کو اللہ کے ذریعہ پہچانو وَاِنَّمَا عَرَفَ اللّٰهَ مَنْ عَرَفَهٗ بِاللّٰهِ فَمَنْ لَمْ یَعْرِفْهُ بِهٖ فَلَیْسَ یَعْرِفُهٗ وَاِنَّمَا یَعْرِفُ غَیْرَهٗ۔
اِحْتَجَبَ عَنِ الْعُقُوْلِ کَمَا احْتَجَبَ مِنَ الْاَبْصَارِ اور بس اللہ کی معرفت وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو اسکو اس کے ذریعہ پہچانتا ہے پس جس نے اسکو اس کے ذریعہ نہیں پہچانا وہ خدا کو نہیں پہچانتا ہے بلکہ غیر خدا کو پہچانتا ہے اس کے ذہن میں جو خدا ہے وہ خدا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عقلوں سے بھی اسی طرح پوشیدہ ہے جس طرح آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ حضرت علیؑ بن الحسینؑ اپنی مناجات میں فرماتے ہیں۔ بِكَ عَرَفْتُكَ وَاَنْتَ دَلَلْتَنِیْ عَلَیْكَ وَدَعَوْتَنِیْ اِلَیْكَ وَلَوْلَا اَنْتَ لَمْ اَدْرِ مَا اَنْتَ" تیرے ہی ذریعہ تجھے پہچانا اور تو نے ہی اپنی طرف میری راہنمائی کی اور تو نے ہی اپنی طرف بلایا اگر تو ایسا نہ ہوتا تو میں نہ جانتا کہ تو کیا ہے اور ہمارے ہادی برحق حضرت محمدؐ عربی کا یہ عرض کرنا اَضِفْنِیْ اِلَیْكَ بِالْعُبُوْدِیَّةِ یَا رَبِّ پروردگار مجھ میں نشان عبودیت و عبدیت پیدا کر کے اپنے پاس مہمان بلا اسی طرف اشارہ ہے کہ مجھے تو اپنی معرفت کے خوانِ کرم پر مہمان کر اور مقام معرفت تک تو ہی پہنچا اور اس کی قبولیت کا اس میں ذکر ہے اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا" وَدَنٰى فَتَدَلّٰى فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰى" معرفت کے اس مقام پر پہنچے جہاں کوئی نہ پہنچ سکا تھا۔ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔ وَیُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ جس میں جیسی قابلیت و استعداد دیکھتا ہے ایسا ہی درجہ عنایت کرتا ہے وَهُوَ الْعَدْلُ وَلَا جَوْرَ فِیْ حُکْمِهٖ فَسُبْحَانَ مَنْ لَّا یَعْلَمُ ذَاتَهٗ اِلَّا ذَاتُهٗ وَتَوْحِیْدُهٗ اِیَّاهُ تَوْحِیْدُهٗ" پس پاک ہے وہ ذات جس کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور توحید اسی کی توحید ہے اور وہی موجبِ نجات ہے پس معرفت الٰہی معلم کو چاہتی ہے بغیر معلم اس کی تکمیل ناممکن ہے اور عبادت معرفت پر موقوف ہے جب معرفت حاصل نہ ہوئی تو حصول عبادت صحیح محال۔ خصوصاً جبکہ یہ مسلمہ عقلائی ہے کہ عبادت خدا وہی ہے جو پسندیدہ خدا ہو جو اس کے منشاء کے مطابق اور اس کی شان کے لائق اور شایان ہو۔ جو عبادت اس کے شان کے شایان اور اس کے منشاء کے مطابق نہیں وہ عبادت پسندیدہ خدا کبھی نہیں ہو سکتی۔ پس اسی طرح

عبادت بھی معلم کی ضرورت ثابت کرتی ہے۔

بخودش کس شناخت توانست	ذاتِ او ہم بدو تواں دانست
بدلیلے حواس کے شاید	کو زبر پُشتِ قُبّہ کے پاید
عقلِ رہبر ولیک قادرِ او	فضلِ او مر ترا برد بر او
بدلیلے عقل رہ نبری	خیرہ چون دیگراں مکن توخری
فضلِ او در طریق رہبر ماست	صنع او سوے او دلیل گواست

کرمش گفت مرمرا بشناس
ورنہ کہ شناسدے بعقل و حواس

پنجم ۔ نتیجہ یہ کہ معرفتِ خدا وہی صحیح ہے جو اس کی تعلیم کے موافق ہو۔ عبادتِ خدا وہی درست ہے جو اس کی بتلائی ہوئی اس کی شان کے شایان ہو۔ لہٰذا حقیقی معلّم توحید و معلم عبادت خدا ہی ہے مگر پھر غور کا مقام ہے کہ سارے بندے اس کی مخلوق ہیں بندے اس کی معرفت کے طالب ہیں۔ بندے اس کی عبادت کے شائق ہیں۔ سوائے دہریوں کے کل اس میں شامل ہیں اور خدا علیم و حکیم ہے رؤف رحیم ہے ذوالفضل العمیم حکیم و الکرم الجسیم ہے جواد ہے فیاض ہے پھر یہ اختلاف معرفت و عبادت کیسا ہے؟ کیوں سارے بندے سچے عارف اور سچے عبادت گذار نہیں ہیں؟ جیسا کہ مشاہد و مسلم ہے۔ فیض و کرم الٰہی میں نہیں ہوسکتا اس کا فیض عام ہے۔ ضرور بالضرور یہاں سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ ہر ایک میں یہ استعداد نہیں ہے کہ براہ راست اس کو تعلیم الٰہی ہو الہام ہو وحی پہنچے اگر ان بندوں میں سے ہر ایک میں بلا واسطہ و وسیلہ خدا سے تعلیم پانے کی قابلیت ہوتی تو ہرگز یہ علم معرفت سے محروم نہ ہوتے اور یہ دلیل و برہان سے ثابت مشابہت و مجانست سے بری ہے وہ ہم جیسا نہیں وہ نہ جسم ہے نہ جسمانی نہ اسے دیکھ سکتے ہیں نہ اُسے چھو سکتے ہیں اور نہ اس کو چکھ سکتے ہیں، نہ اسے سُونگھ سکتے ہیں پھر اُسے پہچانیں تو کیسے پہچانیں اس کو جانیں تو کیسے جانیں۔ اس کی معرفت کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ اس کا کلام ہے پس اس کے کلمات وجودیہ سے اسکو پہچان سکتے خواہ وہ قولی ہوں یا فعلی فَاِنَّ الْعَالَمَ کُلُّهٗ کِتَابُ اللّٰہِ

نیز و آنکہ جانش در تجلی است — ہمہ عالم کتاب حق تعالیٰ است

امیر المومنینؑ "لَقَدْ تَجَلَّی الْحَقُّ لِعِبَادِهٖ فِیْ کَلَامِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ"

حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اپنے بندوں کے لئے جلوہ نمائی فرمائی اور تجلی کی ہے لیکن تم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ کلام میں ہر شخص اس کا جلوہ دیکھ سکتا ہے جبکہ نہ اس کا کلام ہمارا جیسا کلام ہے اور نہ اس کی زبان ہماری

جیسی زبان ہے ہم تو صرف اپنی جنس کا کلام سمجھ سکتے ہیں۔ اور وہ زبان بے زبانی سے تکلم فرماتا ہے۔ اور اس کا کلام نفسِ ایجاد ہے اس کے کلام کو سمجھنا اور اس کی باتیں سننا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

ایں زمیں را آسمانے دیگر است

ہماری قوت سماعت ایک محدود استعداد رکھتی ہے زیادہ فاصلے سے ہوں تو آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہماری عقل محدود ہے ہم ہر ایک آواز کا مطلب نہیں سمجھتے۔ پرندے۔ چرندے۔ درندے سب بولتے ہیں آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے۔ چیونٹیاں تک بولتی ہیں آپس میں باتیں کرتی ہیں۔ اپنے مقاصد و مطالب ایک دوسرے کو سمجھاتی ہیں مگر ہم نہیں سنتے۔ نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ بھی نہیں محسوس کرتے کہ وہ بولتی ہیں پھر اس ذات پاک کا کلام ہم کیونکر سُن سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں جو اعضا و جوارح سے پاک و منزہ ہے۔ اس کا کلام ہماری جیسی آواز نہیں ہے اس کے سننے اور سمجھنے کی ہر ایک میں قابلیت کہاں۔

بسرِ قصۂ سیمرغ و غصۂ ہدہد
کسے رسد کہ شناسائے منطق الطیر است

خدا کی باتیں وہ سنیں جو وہاں تک رسائی رکھتے ہوں اس کے کلام اس کے الہام کا مطلب وہ سمجھے جو اس کی باتیں سمجھ سکتا ہو پس ہم کو تعلیم الٰہی نہ ہونا اس کا نقص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا موجب اس کا منتہائی کمال اور ہمارا منتہائی نقص ہے۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز بے اندام ہست
ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

ششم ۔ ان پانچوں مقدمات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان تعلیم دنیوی کی طرح تعلیم دینی کا بھی محتاج ہے اور اس کو ایک معلم کی ضرورت ہے جس طرح مشاہدہ ہے کہ انسان معلم کی تعلیم سے علوم دنیوی میں طاق ہو جاتا ہے اسی طرح معلم کامل کی تعلیم سے علم الٰہی میں ماہر ہو سکتا ہے۔ پس ہم نہ اپنی عقلِ ناقص سے اس تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ اپنی عدم قابلیت کی وجہ سے اس معبودِ حقیقی سے بلا واسطہ تعلیم پا سکتے ہیں اور جو تعلیم کہ اس کی طرف سے نہ ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتی اس سے حقیقی معرفت اور صحیح عبادت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور باقی انواعِ عالم انسان سے پست تر ہیں وہ ہمارے اور خدا کے درمیان واسطہ فیضانِ تعلیم نہیں بن سکتے ہیں نہ حیوان ہمیں پڑھا سکتے ہیں اور نہ ان کی پرستش اور تعظیم کرنے سے ہمیں معرفت خدا حاصل ہو سکتی ہے اور نہ نباتات کے آگے سجدہ کرنے سے ہمیں علمِ الٰہی نصیب ہو سکتا ہے اور نہ جمادات کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے سے خدا کا فیضان پا سکتے ہیں۔ پتھر یا درخت یا حیوانات کیونکر خالقِ عالم کا کلام سمجھ سکتے ہیں کس طرح وحی کلامی کی تلقی کر سکتے ہیں جبکہ انسان جو اشرف المخلوقات ہیں عاجز ہیں۔ پتھر ہمارے

اور اس کے درمیان واسطہ فیضانِ تعلیم بھی وہی پیدا کر سکتا ہے اور نوعِ بشر سے بالا کوئی نوع نہیں ہے اور جنس جنس سے مانوس ہوتی ہے اور غیر جنس سے انسان مانوس نہیں ہو سکتا اور اس کی صحبت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا وہ تو کوئی خاص بشر ہی ہو سکتا ہے جس میں خدا سے تعلیم پانے کی اور ہمیں تعلیم دینے کی خاص قابلیت پیدا کی گئی ہو وہ خدا تک رسائی رکھتا ہو وہ خدائی کلام سن سکتا ہو ۔ وہ خدائی الہام سمجھ سکتا ہو وہ خدائی پیغام اور شیطانی وسوسہ میں تمیز کر سکتا ہو ۔ نہیں بلکہ وہ ایسا انسان ہو جس کا دل وساوسِ شیطانی سے پاک ہو اور شیطانی وسوسوں کو اس میں دخل نہ ہو ورنہ بہت ممکن ہے کہ اس کے دل میں شیطانی وسوسے پیدا ہوں اور وہ کہدے کہ یہ الہامِ ربانی ہے اِنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى اَوْلِيَآئِهِمْ (انعام ع۱۴) بے شک شیاطین اپنے محبت کرنے والوں کو کچھ القاء کیا کرتے ہیں اور اس طرح بہکایا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے جھوٹے مدعیانِ ہدایت و داعی الی اللہ بنتے رہتے ہیں اور اسی سے جھوٹے مذاہب پیدا ہوئے ہیں۔ کلامِ پاک یہ بھی پتہ دیتا ہے کہ شیاطین کس پر نازل ہوتے ہیں وحی شیطانی کس کو ہوتی ہے اور رحمانی کس کو ہوتی ہے هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كَاذِبُوْنَ ۔ (۲۲)

معرفتِ خدا کے حصول کا طریقہ

یاد رہے کہ آیتِ کریمہ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران آیت ۸) کی رُو سے خدا تعالیٰ کی معرفت کے حصول کے بھی دو۲ طریق ہیں ۔ ایک محکم اور دوسرا متشابہ صفاتِ الٰہیہ کا وہ پہلو جو محکم ہے سورۂ اخلاص میں بیان ہوا ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کی معرفت بلحاظ ذاتی توحید کے حاصل ہوتی ہے اور صفاتِ الٰہیہ کا وہ پہلو جو متشابہ ہے وہ سورۂ فاتحہ میں بیان کیا گیا ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کی معرفت بلحاظ صفاتی توحید کے حاصل ہوتی ہے ۔

متشابہ صفات سے اگرچہ بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید انسان بھی ان صفات میں اللہ تعالیٰ کا شریک ہے جیسا کہ سورۂ دہر کی آیت ہے کہ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ (آیت ۳) کہ انسان کو سمیع و بصیر بنایا گیا ہے اور پھر یہی صفت سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی آتی ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (آیت ۲) یعنی خدا تعالیٰ کی ہستی سمیع و بصیر ہے لیکن جب ہم اِن متشابہ صفات کو اس معیار پر جانچیں گے جو لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے لئے بیان ہوا ہے تو فوراً وہ شبہ

دور ہو جائے گا۔ پس یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متشابہ صفات کے ساتھ قرآنِ حکیم میں اپنی محکم صفات کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ کسی قسم کے شک کا احتمال باقی نہ رہے یعنی ایسی صفات کا ذکر جن سے بالبداہت ظاہر ہے کہ خدا کو انسان کے ساتھ کچھ بھی شراکت نہیں اور نہ انسان کو خدا کے ساتھ کچھ مشارکت ہے۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ انسان کے سُننے اور دیکھنے کے کیا ذرائع ہیں اور خدا کے سننے اور دیکھنے کے کیا ذرائع ہیں ظاہر ہے کہ انسان کا سُننا کان کے عضو کی خاص ساخت اور خارجی ہوا کی بدولت ہے لیکن کیا خدا بھی انسان کی طرح سُننے کے لئے ان چیزوں کا حاجت مند ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اپنی قدرتِ مطلقہ سے یہ کام لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کا دیکھنا آنکھ کے عضو اور اس کے سات پردوں اور خارجی روشنی کا مرہون منت ہے لیکن کیا خدا بھی دیکھنے کے لئے انسان کی طرح ان اشیاء کا محتاج ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس لیس کمثلہ شیئ کے اصل کے ماتحت معلوم ہو گیا کہ خدا کا سُننا اور دیکھنا انسان کے سُننے اور دیکھنے سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے گویا سمیع و بصیر کی متشابہ صفت جو کسی حد تک شرک کا شبہ پیدا کر سکتی تھی لیس کمثلہ شیئ کے محکم اصل کے ماتحت بالکل توحید کے رنگ میں آگئی۔

باقی رہا یہ سوال کہ محکم صفات کے ساتھ متشابہ صفات کو کیوں پیش کیا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنی محکم صفات کے ساتھ انسانی فہم سے بہت بالا تھا اور بوجہ غیب الغیب ہونے کے انسان کو اس پر ایمان لانے کے لئے مکلف کرنا تکلیفِ مالا یطاق تھی اس لئے انسان کی سہولت کے لئے محکم صفات کے ساتھ متشابہ صفات کو بھی پیش کر دیا گیا۔ اور قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز پر ایمان لانے کے لئے انسان کو مکلف کیا جاتا ہے اس کا اگر ایک پہلو مخفی ہو تو دوسرا پہلو ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم ہے تو خدا کی ذات اگرچہ مخفی ہے لیکن اس کے افعال ظاہر ہیں۔ اگر خالق پردۂ غیب میں ہے تو مخلوق جو آئینہ خالق نما ہے بے پردہ نظر آتی ہے۔ اسی طرح اجرام سماوی و ارضی میں جو سلسلۂ تغیرات جاری ہے اس کے مخفی اسباب کے بارے میں کوئی کچھ کہے اسلام میں ان کو ملائکہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بوجہ لطیف ہونے کے اگرچہ وہ خدا تعالیٰ کی طرح مخفی ہیں لیکن ان کے افعال مصنوعات کے ذریعہ ان کی ہستی کا برابر پتہ دے رہے ہیں کیونکہ خلقت خالق کی ہستی پر دلالت کرتی ہے اور صنعت صانع کی ہستی پر۔ اور ہر ایک حرکت خواہ وہ مخفی ہو یا ظاہر اپنے محرک کے لئے ایک دلیل ہے۔

اسی طرح انبیاء اور کتبِ سماوی پر ایمان لانے کا حکم ہے تو انبیاء اور کتبِ سماوی کا وجود ظاہر ہے لیکن ان کی حقیقت مخفی یعنی انبیا اور کتبِ سماوی کے ظاہری وجود کو تو کافر بھی مانتے ہیں لیکن یہ حقیقت کہ انبیاء جو بظاہر دوسرے انسانوں کی طرح نظر آتے ہیں اُن میں نبوت کی شان بھی پائی جاتی ہے اس سے وہ منکر ہیں یا یہ حقیقت کتب سماوی جو اپنے الفاظ کے لحاظ

سے بظاہر انسانی کتب کے مشابہ نظر آتی ہیں ۔ درحقیقت خدا کا کلام ہیں اس سے کافر لوگ منکر ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی محکم
اور متشابہ صفات آپس میں اصل اور فروع کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ (۴۴)

آیت مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ کے رد سے خدا تعالیٰ کی معرفت
کے لئے بھی دو طریق پیش کئے گئے ہیں ایک محکم دوسرا متشابہ ۔ خدا تعالیٰ کی معرفت کے حصول کے لئے محکم پہلو کیساتھ
متشابہ پہلو کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور صفات الٰہیہ کا وہ پہلو جو محکم طریق پر پیش کیا گیا۔ جیسا کہ سورۃ اخلاص میں بطور نمونہ کے
دکھایا گیا اس سے خدا تعالیٰ کی معرفت بلحاظ ذاتی توحید کے حاصل ہوتی ہے۔

اور صفات الٰہیہ کا وہ پہلو جو متشابہ طریق پر پیش کیا گیا اس سے خدا تعالیٰ کی معرفت بلحاظ صفاتی توحید کے
حاصل ہوتی ہے اور ذات گو صفات سے الگ نہیں ہوتی اور نہ ہی صفات ذات سے الگ ہوتی ہیں لیکن اعتبارات عقلی
کے لحاظ سے دونوں کی حیثیت جداگانہ محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً خدا تعالیٰ کی ذات جو وحدت محضہ کی خصوصیت سے
مختص ہے۔ اور تکثر سے بالکل پاک اس کی صفات بھی اس وحدت محضہ کے دائرہ کے اندر پائی جاتی ہیں۔ جو شانِ الوہیت
سے مختص ہے۔ کائناتِ عالم کا منظر جس کے عجائبات کی نیرنگیوں سے انسان محوِ حیرت ہو کر ایسے گردابوں میں پڑا کہ جس کی وجہ
اس کے غلط اندازوں نے جو ظلمت جہالت اور لاعلمی اور عدم معرفت الٰہیہ سے تاریک و تار تھے۔ اسے انواع اقسام کی
مخلوق کا پرستار بنا کر چھوڑا ۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے خدا تعالیٰ کی رحمانی صفت قرآنی تعلیم کے ساتھ متجلی ہوئی
اور جو احسان دُنیا کے ظلمت کدہ پر قرآنی تعلیم کے ضیا بار سورج کے ذریعے ظہور میں آیا وہ فرزندانِ توحید سے پوشیدہ
نہیں۔ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت کے حصول کے لئے انسانی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے عالمِ موجودات
پر جس طریق سے نظرِ تدبر و تفکر ڈالنے کے لئے توجہ دلائی ہے۔ وہ نہایت ہی سہل اور سادہ اور عام فہم ہے اور
موثرانہ حیثیت کے ساتھ اپنی حسن و خوبی سے نہایت دلکش اور دلکشا ہے۔ جس سے انسان عارفانہ بصیرت اور عاشقانہ جذبہ
کے ساتھ اندر ہی اندر خدا تعالیٰ کے تعلقات کو محسوس کرتا ہوا اس بلندی کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ جس کی چوٹی قدس کی
بے مثال رفعت کا شاندار منظر اور مقام ہے۔ اور جو مادی دُنیا کی انتہائی بلندیوں سے اتنی بلند اور اونچی ہے کہ جس کے
اندازہ کے لئے کسی بھی مثال میں کوئی نسبت نہیں ملتی۔

قرآن کریم انسان کو خدا کا عارف بنانے کے لئے اور اس کی توحید کے پُرعظمت مرتبہ کی طرف توجہ دلانے کے
لئے سب سے پہلے موجوداتِ عالم کے منظر اور اس کے پُر حقائق صحیفہ کے مطالعہ کی طرف توجہ دلاتا ہے اور وہ اسباق
اور دروسِ معرفت جو قرآن کریم کے متفرق مقامات میں انواع اقسام کے لبریز حقائق کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔
جن کی تفصیل کے لئے یہ تنگ وقت کچھ بھی گنجائش نہیں رکھتا ۔ (۲۸)

الله کو الله ہی سے پہچانو

- کلینی، اصول کافی جلد ۱ ص ۹۳ سطر ۱۳ کراچی

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ کو پہچانو۔ انہی اسماء وصفات سے جو اس نے خود بیان کی ہیں۔ اور رسول کو پہچانو۔ اس کے معجزات سے اور اولی الامر کو امر بالمعروف اور عدل و احسان سے۔

خدا نے پیدا کیا ہے۔ اشخاص و انوار و جواہر و اعیان کو اور اعیان سے مراد ہیں۔ ابدان و جواہر و ارواح اور صاحب عز و جلال نہ جسم سے متشابہ ہے نہ روح سے اور نہ حساس و دراک روحوں کے پیدا کرنے میں کسی کو دخل اور نہ طاقت وہ خلق اجسام و ارواح میں اکیلا ہی خالق۔ پس جب اس سے اجسام و ارواح کی متشابہت کو دور کر دیا جائے تو یہ اللہ کی معرفت سے ہے اور جب اس کو روح و بدن و نور سے مشابہ کر دیا تو پھر اللہ کی معرفت اللہ سے نہ ہوئی۔

امیر المومنینؑ سے کسی نے پوچھا آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا۔ فرمایا اس چیز سے جس سے اس نے اپنی ذات کا تعارف کرایا۔ اس نے پوچھا کیسے کرایا۔ فرمایا وہ کسی صورت سے مشابہ نہیں اور نہ حواس سے محسوس ہوتا ہے۔ نہ کسی شی پر اس کا قیاس کیا جاتا ہے۔ وہ باوجود بعد کے قریب ہے۔ اور باوجود قریب ہونے کے دور ہے۔ ہر شئے سے فوق ہے۔ اس سے مافوق کوئی شے نہیں۔ وہ ہر شئے سے آگے ہے۔ اس سے آگے کوئی شئے نہیں۔ وہ اپنی قدرت سے اشیاء میں داخل ہے۔ لیکن اس چیز کی مانند نہیں۔ جو کسی شئے میں داخل ہو وہ اشیاء سے خارج ہے۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے کوئی کسی چیز سے نکلتی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جو ایسی ہے اور غیر اس کا ایسا نہیں۔ اس کے سوا ہر شئے کی ابتداء ہے۔

- مجلسی، محمد باقر مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۱ حدیث ۱ ایران
- ملا خلیل قزوینی الصافی جلد ۲ ص ۴۱ سطر ۱۲ نولکشور
- فیض کاشانی الوافی جلد ۱ ص ۷۵ سطر ۱ تہران
- کلینی۔ اصول کافی جلد ۱ ص ۱۱۵ سطر ۲ تہران

منصور بن حازم نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بیان کیا کہ میں نے ایک قوم سے مناظرہ کیا۔ اور ان سے کہا۔ اللہ تعالیٰ بزرگ تر ہے۔ اس سے کہ اس کے اسماء و صفات کو پہچانا جائے مخلوق کے قیاس پر۔ بلکہ اس کے مخصوص بندے بذریعہ وحی اس کے اسماء و صفات کو پہچانتے ہیں۔ فرمایا تم پر رحمت خدا ہو۔

- مجلسی، محمد باقر مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۱ حدیث ۲ ایران
- قزوینی، ملا خلیل الصافی جلد ۲ ص ۴۳ سطر ۱۱ نولکشور

کاشانی فیض — الوافی جلد ۱ ص۶ سطر ۲ — تہران

عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ

(میں نے اپنے ربّ کو اپنے ربّ کے ذریعہ پہچانا)

معرفت یا معیت خداوندی کے علم و عرف تک کسی دلیل سے پہنچنا محال ہے۔ بلکہ معرفتِ الٰہی اس کے علم و عرف کی دلیل ہے۔ اس لئے اس میں اس قدر اختلاف ہے کہ اصل معانی کے بالکل خلاف ہوگیا ہے۔ اہل اسلام کے ایک گروہ کے نزدیک تو باری تعالیٰ سب آسمانوں کے اوپر عرش پر بیٹھا ہے۔ دوسرے کے نزدیک وحدت الوجود میں واجب الوجود کے تصرف ذاتی کے سوا سب لغویات ہیں۔ تیسرے گروہ کے نزدیک وہ ہر جگہ موجود۔ نہ اس کے لئے کوئی جہت نہ مکان۔ نہ اس کی گنجائش کے لئے زمین نہ آسمان، نہ اس کے بیان کے لئے قلم نہ زبان۔ نہ اس کے ادراک کے لئے وہم نہ گمان، نہ اس کے عرف کے لئے ظواہر نہ بطون" سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ہ

حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارشاد مبارک ہے کہ "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ"۔ یعنی پہچانا میں نے اپنے رب کو رب سے۔ یعنی رب کے نور سے۔ اور یہ نہایت ہی لطیف قول ہے۔ جو حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے۔ کیونکہ رب کو رب کے غیر سے پہچاننا محال ہے اور یہ حال کے سوا نہیں۔

ارشاد مولیٰ کریم ہے۔ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ پ۲۶۔ رکوع ۱۸)

یعنی یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں نشانیاں ہیں۔ اور تمہارے اپنے نفسوں میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں۔ اور حدیث شریف میں وارد ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ یعنی جس نے پہچانا اپنے نفس کو بے شک اس نے پہچانا اپنے رب کو۔

انسان پر عرف الٰہی میں جس قدر مشکل پیدا ہوئی ہے کسی اور مسئلہ کے لئے واقع نہیں ہوئی بدیں وجہ جو کسی کی سمجھ میں آیا وہی ٹھان لیا۔ چشم بصیرت سے اندھے، حقیقت سے بے خبر، اپنے ظن کے ٹوٹو پر سوار، میدان توحید میں اپنے زعم سے گیندِ عرف کو انتہائے مقصود پر لے گئے ہیں اور اپنے جہل کو کمالِ معراج سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ یہ عقل و قیاس کا راستہ ہی نہیں۔ بقول بزرگ! "عقل بڑی چیز ہے لیکن جس ترازو سے سونے چاندی کو وزن کیا جائے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے پہاڑ کو بھی تول سکیں۔" عقل کا احاطہ موجودات اور محسوسات

کاشانی فیض — الوافی جلد ۱ ص۶ سطر ۲ — تہران

عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ

(میں نے اپنے ربّ کو اپنے ربّ کے ذریعہ پہچانا)

معرفت یا معیت خداوندی کے علم و عرف تک کسی دلیل سے پہنچنا محال ہے۔ بلکہ معرفتِ الٰہی اس کے علم و عرف کی دلیل ہے۔ اس لئے اس میں اس قدر اختلاف ہے کہ اصل معانی کے بالکل خلاف ہوگیا ہے۔ اہل اسلام کے ایک گروہ کے نزدیک تو باری تعالیٰ سب آسمانوں کے اوپر عرش پر بیٹھا ہے۔ دوسرے کے نزدیک وحدت الوجود میں واجب الوجود کے تصرف ذاتی کے سوا سب لغویات ہیں۔ تیسرے گروہ کے نزدیک وہ ہر جگہ موجود۔ نہ اس کے لئے کوئی جہت نہ مکان۔ نہ اس کی گنجائش کے لئے زمین نہ آسمان، نہ اس کے بیان کے لئے قلم نہ زبان۔ نہ اس کے ادراک کے لئے وہم نہ گمان، نہ اس کے عرف کے لئے ظواہر نہ بطون" سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ہ

حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارشاد مبارک ہے کہ "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ"۔ یعنی پہچانا میں نے اپنے رب کو رب سے۔ یعنی رب کے نور سے۔ اور یہ نہایت ہی لطیف قول ہے۔ جو حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے۔ کیونکہ رب کو رب کے غیر سے پہچاننا محال ہے اور یہ حال کے سوا نہیں۔

ارشاد مولیٰ کریم ہے۔ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (پ ۲۶ رکوع ۱۸)

یعنی یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں نشانیاں ہیں۔ اور تمہارے اپنے نفسوں میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں۔ اور حدیث شریف میں وارد ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ یعنی جس نے پہچانا اپنے نفس کو بے شک اس نے پہچانا اپنے رب کو۔

انسان پر عرف الٰہی میں جس قدر مشکل پیدا ہوئی ہے کسی اور مسئلہ کے لئے واقع نہیں ہوئی بدیں وجہ جو کسی کی سمجھ میں آیا وہی ٹھان لیا۔ چشم بصیرت سے اندھے، حقیقت سے بے خبر، اپنے ظن کے ٹٹو پر سوار، میدان توحید میں اپنے زعم سے گیند عرف کو انتہائے مقصود پر لے گئے ہیں اور اپنے جہل کو کمالِ معراج سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ یہ عقل و قیاس کا راستہ ہی نہیں۔ بقول بزرگ! "عقل بڑی چیز ہے لیکن جس ترازو سے سونے چاندی کو وزن کیا جائے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے پہاڑ کو بھی تول سکیں"۔ عقل کا احاطہ موجودات اور محسوسات

تک ہے اور یہ میدان اس سے وراء الوراء ہے یہی وجہ ہے کہ جو کچھ علم یعنی خبر صادق قرآن حکیم سے سنا یا پڑھا اس کے مفہوم کو اپنے ہی قیاس و خیال کے سانچے میں ڈھال لیا۔

(الانسان فی القرآن ص۶۵ سطر ۱۳ لاہور)

معرفت خدا کے لئے عقل کافی نہیں

عقل عبودیت کے لئے ایک آلہ ہے یہ اس لئے نہیں ہے کہ ذاتِ خداوندی کی طرف جھانک کر دیکھ سکے۔ عقل تو صرف دنیا کے گرد چکر لگا سکتی ہے مگر جب خالق دنیا کی طرف نگاہ اٹھاتی ہے تو پگھل جاتی ہے۔ جب خدا نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا میں کون ہوں؟ عقل خاموش رہی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اسے وحدانیت کا سُرمہ لگایا تب جاکر عقل نے آنکھیں کھولیں اور کہا تو خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عقل میں اس قدر طاقت نہیں اللہ کی مدد کے بغیر اسے پہچان سکے بس وہی شخص اللہ کو پہچان سکتا ہے جسے خود اللہ جل جلالہٗ اپنی معرفت عطا کردے۔

من رامه بالعقل مسترشداً سرّحه فی حیرة یلهو

یعنی جس کسی نے عقل کی راہنمائی کے ذریعہ اللہ تک پہنچنے کا مقصد کیا تو عقل اسے حیرت میں سرگرداں کردیگی

وشاب بالتلبیس اسرارہٗ یقول فی حیرته هل هو

یہ عقل اسرار خداوندی کو خلط ملط کر کے مشتبہ بنا دے۔ یہاں تک کہ انسان حیرت زدہ ہو کر کہہ اُٹھے گا کیا خدا موجود بھی ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تَفَکَّرُوْا فِیْ خَلْقِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِی اللّٰہِ فَاِنَّکُمْ لَنْ تَقْدِرُوْا قَدْرَہٗ۔ خدا کے بنائے ہوئے عالم فطرت پر غور کرو۔ مگر ذات باری میں فکر نہ کرو۔ تم کو یہ قدرت نہیں کہ اُس کی قدرت کا اندازہ کرسکو۔

معرفت خدا کی طرف سے واجب نہیں؟

احادیث میں جہاں یہ وارد ہے کہ معرفت خدا کی طرف سے ہوا کرتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ خداوند کریم بندوں کو عقل عطا فرماتا ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان محبت کے فرائض ادا کرتی ہے اور ان پر اسی قدر معرفت واجب کرتا ہے جس قدر ان کی قدرت و وسعت کا تعلق ہے اور جس مقام تک ان کے عقول میں ڈال دیتا ہے تاکہ حجت تمام ہو جائے یعنی اللہ سبحانہ کی عنایت عالیہ اور رحمت واسعہ کا تقاضا یہی ہے کہ وحی۔ الہام۔ تعلیم انبیاء

و مرسلین یا ہدایت آئمہ طاہرین علیہم السلام کے ذریعہ سے ان کو اپنی شناخت کروائے تاکہ انہیں اتنا معلوم ہو جائے کہ ہمارا خالق موجود ہے جس کی اطاعت حسب امکان ہم پر لازم ہے اور ہماری بازگشت کا بھی ایک دن ہے جس کے لئے زادِ راہ کی تحصیل ہم پر واجب ہے اور نیز اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے تمام ذرائع کا خدا خود ہی انتظام فرماتا ہے۔ وہی توفیق عطا فرماتا ہے کہ علم و یقین حاصل کر کے ملکۂ طہارت و تقویٰ کی تحصیل ان کے لئے ممکن ہو جائے اسی طرح معارف ضرور یہ کی تحصیل پر انسان کو جو قدرت حاصل ہے وہ اسی کی عطا فرمودہ ہے اور یہ سب کچھ اس کا فیض عمیم اور لطف جسیم ہے۔ کیونکہ اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے کہ اسباب و ذرائع پر قدرت ہونے کے بغیر تکلیف بالمحال لازم آتی ہے اور خدا تکلیف بالمحال سے منزہ و قدوس ہے لہٰذا ضروری ہے کہ بندوں کو اسباب و ذرائع پر قدرت کی توفیق اسی کی جانب سے ہو۔

خدا کی طرف سے بندوں پر انعام جن میں بندوں کا کوئی دخل نہیں۔ وجود تندرستی عقل۔ عقل کو بذریعہ وحی الہام یا تعلیم انبیاء و آئمہ بیدار کرنا۔ عقل میں نفع و نقصان کی تمیز اور خیر و شر میں فرق۔ یہ سب چیزیں اللہ کی طرف سے اتمام حجت ہیں اس کے بعد بندوں پر واجب ہے کہ یقین و معرفت کی تفصیلی منازل وہ خود طے کرے۔

پس حدیثوں میں معرفت کا خدا کی طرف سے ہونے کا مطلب یہی ہے کہ تحصیل معرفت کے ابتدائی اسباب و ذرائع۔ قدرت و توفیق تنبیہ و ارشاد وغیرہ اس کی جانب سے ہوتا ہے اور علماء نے جو وجوب نظر و فکر پر دلیل عقلی قائم ہے کہ معرفت خدا انسان کا فطری فریضہ ہے۔ اس سے مراد توفیق و ارشاد کے بعد عرفان کی تفصیلی منازل طے کرنا ہے۔ یعنی مبداء و صانع اور محسن حقیقی کا تصور قہری و فطری چیز ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور دلیل عقلی سے حد یقین تک پہنچنا انسان کا اپنا عہدہ ہے جو نظر و فکر سے پورا ہو سکتا ہے۔ (دین و اسلام)

ادنیٰ معرفت

- کلینی۔ اصول کافی جلد ۱ ص ۱۱۵ سطر ۱ تہران ص ۹۴ سطر ۱۷ کراچی

فتح بن یزید سے روایت ہے کہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ خدا کی ادنیٰ معرفت کیا ہے۔ فرمایا یہ اقرار کرنا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ نہ کوئی اس کی نظیر ہے۔ نہ مثل و مانند اور وہ قدیم اور ثابت الوجود اور موجود ہے اور فنا ہونے والا نہیں ہے۔ اور اس کی مثل کوئی شے نہیں۔

- مجلسی، محمد باقر مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۲ حدیث ۱ ایران
- قزوینی، ملا خلیل الصافی جلد ۲ ص سطر آخر نولکشور
- کاشانی، فیض الوافی جلد ۱ ص ۷۶ سطر ۱ تہران
- کلینی اصول کافی جلد ۱ ص ۱۱۶ سطر ۳ تہران ص ۹۴ سطر آخر کراچی

طاہر بن حاتم سے مروی ہے۔ اس نے آئمہ کے بارے میں غلو سے باز آنے کے بعد امام رضا علیہ السلام کو لکھا وہ کیا ہے جس کے بغیر معرفت خالق کافی نہیں۔ حضرت نے لکھا۔ اس کا اقرار کہ وہ ہمیشہ سے عالم، سامع اور بصیر ہے۔ اور جو ارادہ کرتا ہے اس کا پورا کرنے والا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے کسی نے پوچھا۔ وہ کیا ہے اس کے بغیر معرفت کافی نہیں ہے۔ فرمایا اس کا اقرار کہ اس کی مثل کوئی شئے نہیں۔ اور نہ اس سے ملتی جلتی کوئی شئے ہے۔ اور یہ کہ وہ ہمیشہ سے سمیع و بصیر ہے۔

- مجلسی، محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۲ حدیث ۲ — ایران
- قزوینی، ملا خلیل — الصافی جلد ۲ ص ۴۴ سطر ۱۲ — نولکشور
- کاشانی، فیض — الوافی جلد ۱ ص ۷۶ سطر ۱۳ — تہران
- کلینی، — اصول کافی جلد ۱ ص ۱۱۶ سطر ۸ ۔ ص ۹۵ سطر ۵ — کراچی

ابراہیم بن عمر سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا کہ انہوں نے فرمایا خدا کا ہر ایک امر عجیب ہے۔ لیکن اس نے تم پر حجت تمام کی ہے۔ اسی چیز سے جس سے اس نے اپنی ذات کا تعارف تم سے کرایا ہے۔

- مجلسی، محمد باقر — مراۃ العقول جلد ۱ ص ۶۲ حدیث ۳ — ایران
- قزوینی، ملا خلیل — الصافی جلد ۲ ص ۴۴ سطر آخر — نولکشور
- شیخ صدوق — جامع الاخبار ص ۴ سطر ۱۹ نجف — ص ۱۰ سطر آخر کراچی

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا جو تم میں سے اپنے نفس کا زیادہ پہچاننے والا وہی ہے خدا کا سب سے زیادہ پہچاننے والا ہے۔

- جامع الاخبار — ص ۵ سطر ۷ نجف — ص ۱۱ سطر آخر کراچی

ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پوچھا: اس کا علم کیا ہے؟ فرمایا خدا کی معرفت جو حق اس کی معرفت کا ہے۔ اس نے کہا کہ حق معرفت کیا ہے۔ فرمایا یہ ہے کہ انسان اس کو بلا شبہ و مثال کے پہچانے (یعنی کسی کو اس کا مثل و مانند قرار نہ دے اور یہ سمجھے کہ وہ ایسا خالق مطلق ہے کہ اس کو اپنی اخلاقی دکھلانے میں کسی مثال یا شبہ کی ضرورت نہیں اور یہ کہ اس کو خدائے واحد و خالق و قادر اوّل و آخر ظاہر و باطن بے مثل و نظیر سمجھے یہ ہے خدا کی معرفت۔

- جامع الاخبار — ص ۵ سطر ۱۱ نجف — ص ۱۲ سطر ۵ — کراچی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: ایمان میں افضل وہی شخص ہوگا جو معرفت میں افضل ہوگا۔

- جامع الاخبار — ص ۵ سطر ۱۲ نجف — ص ۲۱ سطر ۷ — کراچی

حضرت علی علیہ السلام سے کسی نے پوچھا آپ نے خدا کی معرفت کس چیز سے حاصل کی ہے ؟ فرمایا جس سے اپنے نفس کی معرفت حاصل کی ۔ کوئی صورت اس میں تشبیہ نہیں ڈال سکتی اور کسی آدمی کا اس پہ قیاس نہیں کیا جاسکتا وہ باوجود بعید ہونے کے قریب ہے اور باوجود قریب ہونے کے بعید ہے (یعنی علم وقدرت کی بنا پر تو رگ گردن سے زیادہ قریب ہے اور اپنی مجد وعظمت کی وجہ سے ادراک وفہم سے دور ہے ۔ وہ قوی ہے اور ہر شے سے بالاتر ہے اس کی قدرت ہر شے کے آخر تک ہے کوئی حصہ اس کے تصرف سے خارج نہیں پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی شے اس سے اوپر ہے یا اس سے نیچے ہے یا اس سے آگے یا پیچھے ہے وہ ہر شے میں داخل ہے مگر نہ اس طرح جیسے ایک چیز دوسرے میں داخل ہوتی ہے وہ ذات جو ایسی ہے اور اس کے سوا کوئی ایسا نہیں ۔

معرفت خدا کے دو راستے

خداشناسی کے سلسلے میں قدیم زمانے سے لے کر آج تک ہزاروں بلکہ لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور علماء اور غیر علماء کے درمیان لاکھوں، کروڑوں بار بحثیں ہو چکی ہیں ۔ ہر ایک نے اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے مختلف راہوں کا انتخاب کیا ہے لیکن ان تمام راہوں سے بہترین اور ہمیں عالم ہستی کے اس عظیم مرکز تک جلد پہنچا دینے والے دو راستے ہیں ۔

▲ ـــــ اندرونی (یا نزدیک ترین راستہ)

▲ ـــــ بیرونی (یا روشن ترین راستہ)

پہلی قسم کے بارے میں ہم اپنے وجود کی گہرائیوں میں اس راہ کو تلاش کریں گے اور توحید کی آواز اپنے باطن سے سنیں گے ۔

دوسری قسم کے بارے میں ہم اس عظیم جہان ہستی میں سیر کریں گے ۔ خدا کی نشانیاں تمام مخلوقات کی پیشانیوں اور کائنات کے ہر ذرے کے دل میں مشاہدہ کریں گے ۔ اگرچہ ان ہر دو راستوں کے لئے طولانی بحث درکار ہے لیکن ہم کوشش کریں گے کہ ایک اجمالی گفتگو میں ان دونوں راہوں کا خلاصہ پیش کر دیں ۔

اندرونی راستہ

اس موضوع پر چند نکتے قابلِ غور ہیں :

● دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہر انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی قوم اور قبیلے یا نسل اور نژاد سے کیوں نہ ہو اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے کسی قسم کی تعلیم بھی نہ دی جائے حتیٰ کہ خدا پرستوں یا مادہ پرستوں کی آواز بھی اس کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے اس کے باوجود وہ خود بخود ایک ایسی مقتدر اور توانا ذات کی طرف متوجہ ہو جائے گا جو "عالم مادہ" سے

بالا تر ہے اور تمام کائنات پر اسی کی حکومت ہے۔
وہ اپنے دل کے مختلف گوشوں اور قلب و روح کی گہرائیوں سے احساس کرے گا کہ اسے ایک لطیف، مہر و محبت سے بھر پور، شیریں اور محکم آواز سنائی دے رہی ہے جو اسے علم و قدرت کے عظیم مرکز (جسے ہم "خدا" کہتے ہیں) کی طرف بلا رہی ہے۔
یہ بشر کی مقدس، ہر قسم کی آلائش سے پاک اور معصوم فطری آواز ہے۔

● ممکن ہے کہ مادی دنیا کا شور و غل اور زرق و برق دنیاوی زندگی کی چکا چوند انسان کو حقائق کے ادراک سے غافل کر دے اور وہ وقتی طور پر پاک انسانی فطرت کی ندا کو نہ سن سکے لیکن جب وہ خود کو مشکلات اور مصائب میں گھرا پاتا ہے یا ہوائی جہاز پر سوار ہوتا ہے لیکن موسم کی خرابی کی بنا پر ہوائی جہاز خطرناک حالات سے دوچار ہو جاتا ہے اور اسے مادی دنیا کے ظاہری وسائل کے ذریعے بچنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی تو ایسے حالات میں یہی فطری آواز اسے سنائی دیتی ہے جو اس کی ڈھارس بندھاتی ہے۔ اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندرونی وجود سے کوئی "طاقت" اسے اپنی طرف بلا رہی ہے جس کے سامنے موجودہ تمام مشکلات اور مصائب بالکل ہیچ ہیں۔
آپ بہت کم ایسے لوگوں کو پائیں گے جو زبردست مصیبتوں میں گھر جائیں اور اس "غیر مرئی طاقت" کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ اور غیر اختیاری طور پر خدا کو یاد نہ کریں۔ لہٰذا اسی چیز سے پتہ چلتا ہے کہ ہم اس ذات کے کس قدر قریب ہیں اور وہ ذات کس قدر ہمارے قریب ہے۔
یاد رہے کہ فطرت کی یہ آوازیں تو ہمیشہ ہی انسان کے اندر موجود رہتی ہے لیکن حساس لمحوں میں اس میں قوت آجاتی ہے۔

● تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے قدرت مند اور مغرور لوگ جو عام حالات میں خدا کا نام لینا گوارا نہیں کرتے تھے جب انہوں نے اپنی قدرت اور طاقت کو متزلزل ہوتا دیکھا اور اپنی ہستی کے محل کو گرتا محسوس کیا تو فوراً اس مبدأ عظیم کی طرف متوجہ ہوئے اور فطری آواز کو بڑی صراحت کے ساتھ سُنا۔
تاریخ بتاتی ہے کہ جب فرعون نے اپنے آپ کو دریائے نیل کی موجوں کے درمیان پایا اور دیکھا کہ جو پانی اس کی زندگی کا سرمایہ، ملک کی آبادی کا سرچشمہ اور اس کی تمام مادی طاقت کا اہم ترین ذریعہ تھا آج اس کی موت کا سامان فراہم کر رہا ہے اور وہ دریا کی چند معمولی موجوں کے سامنے بے بس ہو چکا ہے نیز جان بچنے کا کوئی ظاہری وسیلہ بھی نظر نہیں آتا۔ تو چیخ کر کہتا ہے کہ:
"میں گواہی دیتا ہوں کہ موسیٰؑ کے عظیم المرتبت خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔"
درحقیقت یہ آواز اس کی فطرت اور دل کی گہرائیوں سے اُٹھ رہی تھی۔ فرعون ہی پر کیا موقوف ہر وہ

انسان جو اس طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے ایسی آواز کو سنتا ہے۔

خود آپ بھی جب اپنے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیں تو اس بات کی یقیناً تصدیق کریں گے کہ وہاں ایک ایسا نور روشن ہے جو آپ کو خدا کی ذات کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ یقیناً آپ کو زندگی میں بارہا ایسے حوادث کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جن سے بچ نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی ہوگی لیکن انہی حالات میں فوراً یہ حقیقت سامنے نظر آئی ہوگی کہ اس عالم ہستی میں کوئی ایسی طاقت ہے جو آپ کو ان حوادث سے بچا سکتی ہے۔ ایسی حالت میں اس مبدأ ہستی کے ساتھ "امید العشق" نے آپ کو اپنی "گود" میں لے لیا ہوگا جس کی وجہ سے آپ کے دل پر چھائے ہوئے ناکامی، نا امیدی اور مایوسی کے تیرہ و تاریک بادل چھٹ گئے ہوں گے۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ یہ وہ نزدیک ترین راہ ہے جسے تلاش کر کے ہر انسان خدائے بزرگ و برتر کو پہچان سکتا ہے۔

ایک اہم سوال

ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ:۔

"کیا اس بات کا احتمال نہیں ہے کہ ماں باپ کی تعلیمات اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے حساس اور مشکل مقامات میں ہم اس قسم کا تصور کرتے ہیں اور خدا سے اپنی مشکلات کا حل چاہتے ہیں؟"

اس قسم کے سوال کرنے میں ہم آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور اس کا جواب اگلے سبق میں دیں گے لیکن اس سے پہلے قرآن مجید کی ایک آیت ملاحظہ فرمائیں۔ خدا فرماتا ہے:۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ○

جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور کوہ پیکر موجوں کے تھپیڑے انہیں موت کے دہانے تک پہنچا دیتے ہیں) تو وہ خدا کو خلوصِ دل سے پکارتے ہیں لیکن جب انہیں خدا ساحلِ نجات پر پہنچا دیتا ہے تو وہ (خدا کو فراموش کر کے) شرک کرنے لگتے ہیں۔ (سورۂ عنکبوت آیۃ ۶۵)

گذشتہ سبق میں ہم بتا چکے ہیں کہ "توحید اور خدا پرستی کی آواز ہم ہمیشہ اپنے دل کی گہرائیوں سے سنتے ہیں اور مصائب و مشکلات میں یہ آواز خاص طور پر صاف اور واضح سنائی دیتی ہے جس سے ہم بے ساختہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور اس کی لامتناہی قدرت اور بے انتہا عنایات اور مہربانیوں کے طالب ہوتے ہیں۔"

ہو سکتا ہے یہاں پر سوال پیدا ہو کہ: یہ اندرونی آواز جسے ہم "فطرت کی آواز" کہتے ہیں اپنے ارد گرد کے ماحول، مکتب و مدرسے اور ماں باپ کی تعلیمات کا نتیجہ ہے جو ہمارے لئے ثانوی عادت کی صورت اختیار کر گئی ہے دگرنہ حقیقت

میں اس قسم کی کسی چیز کا وجود نہیں ہے یا دوسرے لفظوں میں توہمات اور خیالات ہیں۔

جواب

ایک مختصر سے مقدمے کے ساتھ ہم اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔

عادات اور رسوم ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ تاریخ بشریت اور اقوام عالم میں ہمیں کوئی ایسی علوت یا رسم نہیں ملتی جو ثابت اور برقرار ہو، ممکن ہے کہ بعض چیزیں آج رسم یا عادت کی صورت اختیار کر جائیں لیکن کل وہ خود بخود بگڑ جائیں گی یا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کسی ملک یا قوم میں مرسوم ہو لیکن دوسرے ملک یا قوم میں اس کا نام ونشان تک نہ ہو۔

بنا برایں اگر ہمیں کوئی ایسا موضوع ملتا ہے جو ابتدا سے آج تک تمام اقوام و ملل اور ہر دور میں یکساں اور بلا استثنیٰ موجود چلا آرہا ہے تو ہمیں مان لینا چاہیئے کہ یہ ایک فطری امر ہے جو انسان کی روح اور جان اور رگ و ریشے میں رچا بسا ہوا ہے۔

مثلاً بچے سے ماں کی مامتا کا تعلق کسی تعلیم، پروپیگنڈے یا رائج رسوم و عادات کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ ہمیں نہ تو کسی زمانے میں اور نہ ہی کسی قوم اور ملت میں ایسی نظیر ملی کہ جس میں کسی ماں نے اپنے بچے کے ساتھ اپنی مامتا کا اظہار نہ کیا ہو۔

البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ کوئی ماں اپنے مخصوص ذاتی حالات سے تنگ آکر اپنے بچے کو موت کے گھاٹ اُتار دے یا جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں باپ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ تو اس قسم کے واقعات استثنائی ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی معرض وجود میں آتے ہیں۔ جن کے انجام دینے کے فوراً بعد انسان کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کہ "تم نے غلط کیا ہے"؛ اور جلد ہی وہ اپنی اصلی حالت (یعنی بچے سے ماں باپ کی محبت) کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

اس مقدمے کے ساتھ ہی خدا پرستی کے بارے میں ہم موجودہ اور گزشتہ دور کے انسانوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔

● مشہور مؤرخین اور علمائے اجتماعیات کے مطابق تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں ملتا جس میں بنی نوع انسان کے درمیان "مذہب" یا "مذہب پر ایمان" موجود نہ ہو بلکہ ہر دور اور ہر زمانے میں دنیا کے ہر خطے میں "مذہب" کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ خدا پرستی انسان کے قلب کی گہرائیوں اور اس کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے نا کہ کسی قسم کے رسم و رواج اور پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی قسم کے رسم و رواج یا پروپیگنڈے کا نتیجہ ہوتی تو اس قدر عالمی اور پائیدار نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ ہمارے پاس ایسے قرائن بھی موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ زمانۂ قبل از تاریخ کے لوگ بھی کسی نہ کسی طرح مذہب کے پابند تھے۔ (قبل از تاریخ کا زمانہ وہ کہلاتا ہے جس میں لکھنا پڑھنا ایجاد نہ ہوا تھا

البتہ ہم یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں، چونکہ ابتدائی قومیں خدا کو "مافوق طبیعت" ذات کی صورت میں پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں لہٰذا وہ اسے کائنات میں موجود چیزوں کے درمیان ڈھونڈنے کی کوشش کرتیں اور اپنی اس تلاش کو وہ بتوں کی صورت میں معرضِ وجود میں لے آتیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی فکر میں بھی ترقی آتی گئی اور بالتدریج انسان بت پرستی سے ہاتھ کھینچ کر اس مادی دنیا سے ماوراء خدا کی قدرت سے آشنا ہونے لگا۔

- بعض علمائے نفسیات واضح طور پر کہتے ہیں کہ انسان کی روح میں چار اصلی حسّیں موجود ہیں۔

(۱) "حِسِّ نیکی"

جو تمام بنی نوع انسان کے درمیان اخلاقی اور انسانی مسائل کا سرچشمہ ہے۔

(۲) "حِسِّ دانائی"

جو انسان کو علم اور دانش کے حصول پر آمادہ کرتی ہے خواہ اس علم میں کوئی مادی منفعت ہو یا نہ ہو۔

(۳) "حِسِّ زیبائی"

جس سے انسان کے اندر (صحیح معنوں میں) شعر، ادبیات اور ہنر سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

(۴) "حِسِّ مَذْھَبِی"

جو انسان کو خدا کی پہچان اور اس کے احکام بجالانے کی دعوت دیتی ہے۔

اس ترتیب کو مدِنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "حِسِّ مذہبی" ہی انسان کے اندر ایک ایسی حس ہے جس کی جڑیں انسان کی روح اور دل کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہیں جو نہ تو کبھی اس سے جدا ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ (آسان عقائد)

معرفتِ الٰہیّہ کے مدارج

یاد رہے کہ علم کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ علم الیقین کے نام سے موسوم ہے، دوسرا درجہ عین الیقین کے نام سے اور تیسرا درجہ حق الیقین کے نام سے۔ علم الیقین یہ ہے کہ کسی چیز کا سماع کے ذریعہ پتہ لگایا جائے یا اس کے آثار کے ذریعہ سے۔ عین الیقین یہ ہے کہ کسی چیز کا اپنی رویت کے ذریعہ سے مشاہدہ کیا جائے اور حق الیقین یہ ہے کہ جس حد تک انسانی استعداد کے ذریعہ اس چیز سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس حد تک اس سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اسی طرح معرفتِ الٰہی کا کمال بھی تین درجوں کے طے کرنے سے حاصل ہوتا ہے جن میں سے پہلا درجہ قبولیت دُعا کا ہے، دوسرا درجہ کلام الٰہی کا اور تیسرا درجہ صفاتِ الٰہیہ کی مظہریت کا۔ پہلا درجہ جو قبولیتِ دُعا سے تعلق رکھتا ہے علم الیقین کے مرتبہ پر ہے اور دوسرا درجہ جو کلامِ الٰہی سے تعلق رکھتا ہے عین الیقین کے مرتبہ پر اور تیسرا درجہ جو صفاتِ الٰہیہ کی مظہریت سے تعلق

رکھتا ہے حق الیقین کے مرتبہ پر ہے لیکن یاد رہے کہ ان مدارج سے بھی انسان حسبِ استعداد ہی فیضیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی اپنی تصنیفِ منیف "چشمۂ معرفت" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"فطرتِ انسانی کے لحاظ سے تمام نفوسِ انسانیہ برابر نہیں ہیں۔ کسی کا دائرۂ استعداد بڑا ہے اور کسی کا چھوٹا جس طرح اجرامِ سماویہ چھوٹے بڑے ہیں۔ پس جو چھوٹی استعداد کا نفس ہے گو اس کا تزکیہ بھی ہو گیا۔ مگر چونکہ استعداد کی رُو سے اس نفس کا ظرف چھوٹا ہو گا۔ پس اس لحاظ سے اگرچہ رب ایک ہے لیکن ظروفِ انسانیہ میں منعکس ہونے کے وقت بہت سے رب نظر آئیں گے۔ پس یہی بھید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں یہی کہتے تھے کہ سُبحان ربّی الاعلیٰ۔ سبحان ربّی العظیم۔ یعنی میرا رب سب سے بڑا اور بزرگ ہے۔ پس اگرچہ رب تو ایک ہے مگر تجلیاتِ عظیمہ اور ربوبیتِ عالیہ کی وجہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رب سب سے اعلیٰ ہے۔ (چشمۂ معرفت ۲۳۳) (۳۴)

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو ہستیاں ورا ء الوراء اور غیب الغیب کی حیثیت میں پائی جاتی ہیں۔ ان سے تعلق پیدا کرنا عرفان کے ذریعہ سے ہی ہو سکتا ہے اور عرفان جس کی تکمیل سے کسی مخفی اور غیب الغیب ہستی کا کامل طور پر علم اور انکشاف ہو سکتا ہے وہ تین درجوں پر ہی اشتمال رکھتا ہے۔ پہلا درجہ علم الیقین کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ اور دوسرا عین الیقین کے نام سے تیسرا حق الیقین کے نام سے۔

علم الیقین یہ ہے کہ کسی چیز کا اس کے آثار سے پتہ لگایا جائے۔ عین الیقین یہ ہے۔ کہ اس چیز کو اپنی رویت کے ذریعہ مشاہدہ کیا جائے۔ حق الیقین یہ ہے کہ جہاں تک انسانی استعداد کے لحاظ سے اس چیز سے آگاہی ہو سکتی ہے۔ اور اس کے اثرات سے جس حد تک غایت سے غایت متاثر ہونے کی کیفیت کو اپنے لئے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ درجہ یقین کا اسے حاصل ہو۔

اس کی مثال تینوں درجوں کے لحاظ سے مرزا غلام احمد قادیانی آگ کے دھوئیں سے اور آگ کی روشنی اور شعلے سے اور آگ کی حرارت اور گرمی اور اس کی صفت احراق سے پیش فرمایا کرتے تھے۔ علم الیقین کی مثال ایسی ہے۔ جیسے دھؤاں دور سے نظر آئے۔ اور دیکھنے والے کو آگ کے وجود کے متعلق یہ پہلا درجہ یقین کا حاصل ہوگا۔ کہ جہاں دھواں ہے۔ وہاں آگ ہوگی۔ لیکن پھر بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ مَیں کامل یقین سے کہتا ہوں۔ کہ وہاں آگ ہوگی۔ اس لئے کہ بعض دفعہ آنکھ کو دھوکا لگ جاتا ہے اور گرد و غبار کو دھواں سمجھ لیتی ہے۔ یا ضعف بصر کی وجہ سے آنکھ کو غبار اور دھوئیں کی طرح کچھ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ آگ کے قریب ہو کر اس کے شعلوں کو اور اس کی روشنی کو بھی آنکھ سے دیکھ لے۔ تو یہ مرتبہ عین الیقین کا ہے جو علم الیقین کے درجہ یقینیہ سے ترقی کے لحاظ سے بڑھ کر ہے۔ اور اسی مرتبہ میں انسان کا یقین بہت زیادہ ترقی کے ساتھ بڑھ جاتا ہے۔ مگر اس وقت بھی اس کی ترقی یقین کا ایک مرحلہ ابھی باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس آگ کی

حرارت اور حرقت کا محسوس کرنا ابھی باقی ہے۔ لیکن جب آگ کے پاس بالکل قریب بیٹھنے سے اگر سردی سے ٹھٹھر رہا ہے اور اس کی سردی اس آگ کی گرمی سے دور ہوگئی۔ یا ہاتھ آگے کرنے سے جلنے لگا۔ تو ایسی حالت میں انسان کی یقینی حالت کمال کو پہنچ گئی۔ اور یقین کے اس انتہائی مرتبہ پر پہنچنے سے جو حق الیقین کا مرتبہ ہے کہہ سکتے ہیں کہ آگ کے متعلق اس نے کامل عرفان حاصل کر لیا۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کی غیب الغیب اور وراء الوراء ہستی کے متعلق عرفان کا کمال حاصل کرنا بھی یقین کے انہی درجوں کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ تین درجے اللہ تعالیٰ کے عرفان کے لحاظ سے حسب ذیل ہیں:۔

پہلا درجہ دُعا کی قبولیت کا۔ دوسرا درجہ کلام الٰہی کا۔ تیسرا درجہ صفاتِ الٰہیہ کی مظہریت کا۔

پہلا درجہ دُعا کی قبولیت کا۔ علم الیقین کے مرتبہ پر ہے۔ اور دوسرا درجہ جو الہام الٰہی کا ہے۔ وہ عین الیقین کے مرتبہ پر اور تیسرا درجہ جو صفات الٰہیہ کی مظہریت کا ہے وہ حق الیقین کے مرتبہ میں غلام احمد قادیانی کے دوسرے خلیفہ اپنی کتاب احمدیت میں ان مدارج کے متعلق اپنے پُر معرفت کلام سے یوں مستفیض فرماتے ہیں۔

" اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی ذات کا یقین دلانے کے لئے اور اپنے وجود کا علم دینے کے لئے اور اپنی طرف کھینچنے کے لئے دُعا کا دروازہ کھولا ہے۔ اگر کوئی دعا کرتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ اُسے قبول کرتا ہے۔ بشرطیکہ دُعا اسی طریق پر ہو۔ اور اس حد تک ہو۔ جس حد تک کہ دعا ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؀ (النمل)

یعنی وہ کون ہے جو مضطر کی دُعا سنتا ہے۔ جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس دُعا کو قبول کر کے اس پکارنے والے کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔ اور جو ظالم ہو اس کے ظلم کو دور کر کے اس مظلوم فریادی کو اس کی جگہ پر قائم کر دیتا ہے۔ کیا اس خدا کی طاقت کا کوئی اور بھی ہے۔ مگر تم لوگ نصیحت نہیں حاصل کرتے۔"

" اس درجہ کو اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے کھلا چھوڑا ہے یعنی خواہ کسی مذہب کا آدمی ہو۔ اس کی دُعاؤں کو جب وہ سخت گھبراہٹ میں کی جائیں سنتا ہے اور اس طرح اس امر کا موقعہ دیتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی زندگی اور اس کے تعلق کو محسوس کریں اور شک و شبہ کی حالت سے نکلیں۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ انسانوں کو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ عرفان ہر حالت کے لوگوں کو ملنا چاہیئے کیونکہ انسان توجہ بھی تب ہی کرتا ہے جب اس کے دل میں کسی چیز کی اہمیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

یہ مقام جیسا کہ میں نے بتایا ہے سب مذاہب کے لوگوں کے لئے کھلا ہر مذہب کے لوگ خدا سے دُعا کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اس کا فائدہ محسوس کریں گے اور ان کو معلوم ہوگا کہ بہت سی مشکلات جن سے وہ پہلے تکلیف پاتے تھے۔

دُعا کے ذریعے حل ہو جائیں گی۔ مگر یہ درجہ عرفان کا بہت ہی ناقص درجہ ہے۔ کیونکہ ہر وقت یہ شبہ انسان کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید جو کام دُعا کے بعد ہو گیا ہے اس نے یوں ہی ہو ہی جانا تھا۔ اور شاید جو مصیبت رُک گئی اس نے یوں ہی رُک جانی تھی۔ کیونکہ بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ اتفاقات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہ ہوتا ہوا کام رُک جاتا ہے اور مشکل کام ہو جاتا ہے اور اس کے لئے دُعا بھی کوئی نہیں کی گئی ہوتی۔ بلکہ بعض اوقات وہ شخص جس سے یہ معاملہ گذرا ہوتا ہے۔ دُعا کا قائل ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اس درجہ میں ایک یہ بھی نقص ہے کہ یہ بعض طبعی قوانین سے مشابہ ہے یعنی مسمریزم اور ہپنوٹزم ان دونوں طبعی قوانین کے ذریعہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کئی بیماریاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اور کئی تکالیف دفع ہو جاتی ہیں۔ پس شبہ پڑتا ہے۔ کہ شاید دُعا اسی قسم کی کوئی چیز ہو۔ خدا تعالٰے کی طرف سے کوئی مدد نہ آتی ہو۔ بلکہ صرف اجتماع توجہ کے سبب سے بعض نتائج پیدا ہو جاتے ہوں۔ گو یہ شبہات اس درجہ کی دُعا کے متعلق پیدا ہو سکتے ہوں۔ لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی یہ ایک حد تک یقین کا ذریعہ ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مَیں نے جو یہ کہا ہے۔ کہ اس درجہ کی دُعا کے متعلق یہ شبہات ہو سکتے ہیں۔ تو میرا یہ مطلب ہے۔ کہ ایک درجہ دُعا کا اور ہے جو بالکل یقینی ہے۔ مگر وہ اگلی قسم کے عرفانوں میں شامل ہے۔ اس کا ذکر انہی کے ساتھ کروں گا۔"

دوسرا درجہ عرفان کا کلام الٰہی ہے۔ اسلام اس درجہ کے متعلق خاص زور دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب عام طور پر اس دروازہ کو بند سمجھتے ہیں۔ لیکن عقل اس امر کو نہیں تسلیم کر سکتی کہ وہ خدا جو اپنے بندوں کو اپنی ہستی کا یقین دلانے کے لئے پہلے کلام کرتا تھا۔ اب اُس نے کلام کرنا بالکل ہی بند کر دیا ہے۔ خدا تعالٰی کی صفات تو ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔ وہ تو نقص اور زوال سے پاک ہے۔ پھر یہ خاموشی جو سینکڑوں سال سے شروع ہو کر اب ہزاروں تک پہنچنے والی ہے کیوں ہے اگر وہ کلام نہیں کرتا۔ تو کیونکر سمجھا جائے کہ وہ سُنتا ہے۔ اور پھر کیونکر سمجھا جائے۔ کہ اس کی باقی صفات درست ہیں کیا کسی کا حق نہیں کہ اس کے کلام کے بند ہو جانے پر یہ سوال کرے کہ کیوں نہ سمجھا جائے۔ کہ اب وہ دیکھتا ہی نہیں اور اس کا علم بھی جاتا رہا ہے۔ اور وہ حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔ بلکہ دنیا کا کارخانہ اب آپ ہی آپ چل رہا ہے۔ اگر باقی صفات اس کی اسی طرح کام کر رہی ہیں کہ جس طرح پہلے کام کرتی تھیں تو آج اس کے کلام کا سلسلہ کیوں بند ہو گیا ہے۔ وہ وراء الوراء ہے اور اس کی ذات کا یقین دلانے کے لئے اس کی رویت تو ممکن ہی نہیں۔ ایک اس کا کلام تھا۔ جو لوگوں کو اس کے موجود ہونے کا علم دیا کرتا تھا۔ اب یہ راستہ بھی اگر بند ہو گیا ہے تو پھر اس پر یقین دلانے کا کونسا راستہ کھلا ہے۔

"اے بھائیو اور بہنو! اسلام کہتا ہے کہ یہ خیال کہ خدا کے کلام کا سلسلہ بند ہو گیا ہے درست نہیں۔ وہ اب بھی اسی طرح بولتا ہے جس طرح پہلے بولتا تھا وہ اب بھی اسی طرح اپنے بندوں کو یاد کرتا ہے جس طرح پہلے یاد کرتا تھا۔ بلکہ اُس نے اپنی طرف ہدایت دینے کے لئے کلام کا سلسلہ ہی دُعا کے سلسلہ کی طرح وسیع کیا ہوا ہے اور ایسے لوگوں کو بھی جو خدا کے دین سے دور ہوتے ہیں۔ کبھی الہام ہو جاتا ہے۔ تاکہ وہ راستبازوں کے کلام پر شک نہ کریں۔ بلکہ ان کی صداقت پر گواہ

ہوں۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حٰمٓ سجدہ)

یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ خدا ہمارا رب ہے پس اس امر پر قائم ہو جاتے ہیں۔ کوئی مصیبت ان کو ڈراتی نہیں ان پر فرشتے یہ کلام لے کر نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور نہ اپنے نقصانات پر غم کھاؤ۔ بلکہ خوش ہو اس جنت پر کہ جس کا تم کو وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم تمہاری دنیا کی زندگی میں بھی دوست ہیں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی دوست رہیں گے اور تمہیں وہ چیز ملے گی جو تمہارے نفسوں کی خواہش ہے اور جو کچھ مانگو گے وہ ملے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کلام الٰہی کے نزول کا دروازہ کھلا سمجھتا ہے۔ بلکہ اس کا وعدہ کرتا ہے۔"

پھر فرماتے ہیں" یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ میں نے عام الہام کے الفاظ اس لئے استعمال کئے ہیں۔ کہ مذکورہ بالا شبہات صرف عام الہام کے متعلق ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ورنہ دُعا کی طرح الہام اور وحی کا بھی ایک ایسا درجہ ہے۔ جو تیسری قسم کا عرفان پیدا کرتا ہے اور جیسے اس تیسری قسم کے نیچے بیان کیا جائے گا۔ ورنہ عام الہام دوسری قسم کا عرفان تو پیدا کر سکتا ہے یعنی عین الیقین تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر اس سے اُوپر نہیں لے جاتا۔"

"دونوں قسموں کے عرفانوں کو بیان کرنے کے بعد اب میں تیسری قسم کے عرفان کا بیان کرتا ہوں۔ اسلام اس قسم کے عرفان یعنی حق الیقین کے پیدا کرنے کا بھی دعویدار ہے اور اس پر بڑے زور سے اصرار کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ پانچوں نمازوں میں دن رات میں کوئی چالیس پچاس دفعہ یہ دُعا خدا سے کیا کریں۔ کہ اے خدا تو ہمیں صراط مستقیم دکھا اور وہ صراط مستقیم دکھا جس پر وہ پہلے لوگ گذر چکے ہیں۔ جن پر تو نے انعام کیا تھا۔ اور قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے۔ کہ انعام والے لوگوں سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جن کو خدا تعالےٰ نے نبوت کے مقام پر یا صدیقیت یا شہادت یا صالحیت کے مقام پر کھڑا کیا ہے۔ یعنی یا تو وہ نبی ہیں۔ یا نبیوں کے قریب پہنچے ہوئے ہیں یا وہ نبوت کے مقام کے قریب پہنچے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی صفات کے عملی اثرات کو لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ یا وہ شہادت کے درجہ کی قابلیت پیدا کر رہے ہیں۔"

"اس شبہ کا ازالہ صرف اسلام ہی کرتا ہے اس کی تعلیم پر چل کر ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جو کہ صفات الٰہیہ کے مظہر ہوتے ہیں۔ اور جو پہلے خود اپنی ذات پر صفات الٰہیہ کا پرتو ڈالتے۔ اور پھر دوسروں کو اس کا نشان دکھاتے ہیں اور ہستی باری کا کامل عرفان بخشتے ہیں۔

نوٹ: مؤلف نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا ترجمہ سیدھی راہ دکھا کا ترجمہ کیا ہے جو کہ صحیح نہیں۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اے خدا تو ہمیں سیدھی راہ پر قائم رکھ۔

معرفت نفس معرفت توحید

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ وَمَنْ عَرَفَ رَبَّهُ فَقَدْ كَلَّ لِسَانُهُ کے فقرہ میں خدا کی معرفت کو انسانی نفس کی معرفت پر مبنی قرار دیا گیا ہے جس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی نفس ہی خدا ہے اور پھر طرفہ یہ کہ خدا کی معرفت سے انسان کی زبان ہی بند ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ كَلَّ لِسَانُهُ کے الفاظ سے ظاہر ہے

توضیح :-

یاد رہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ ..... الخ میں انسانی نفس کی معرفت کو اس وجہ سے خدا کی معرفت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی وجود کے دو حصے ہیں۔ ایک جسم اور دوسرے روح جسم کیا ہے؟ چند اعضاء کا مجموعہ۔ اور روح کیا ہے؟ مرکب القویٰ والحواس قسم کی ایک لطیف چیز۔ اب اگر کسی انسان سے دریافت کیا جائے کہ تم نے جسم اور اس کے حواس کہاں سے حاصل کئے ہیں؟ کیا کہیں سے خریدے ہیں یا خود بنائے ہیں؟ تو وہ ان دونوں صورتوں سے انکار کر دے گا اور غور کرنے کے بعد یہی کہے گا کہ میرا جسم اور اس کا ہر ایک عضو اور میری روح اور اس کی ہر ایک حس کسی دوسری ہستی کا فیضان اور عطیہ ہے میری کوششوں کا نتیجہ نہیں۔

پس معلوم ہوا کہ انسان کے تمام اعضاء اور حواس دراصل نہ اس کے اپنے خرید کردہ ہیں اور نہ ہی اس کے اپنے پیدا کردہ۔ بلکہ یہ خدا تعالےٰ کی ہستی کا فیضان اور عطیہ ہیں۔ پس جب صورتِ حال یہ ہے تو انسان حقیقت کے لحاظ سے کیا ثابت ہوا؟ محض نیست اور لاشے۔ اور اس کا وجود معرفت کے لحاظ سے کیا ثابت ہوا؟ خدا کا فیضان اور عطیہ۔

الغرض اگر ان خطوط پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ انسان کی ہر ایک صفت کیا حیات اور کیا قدرت اور کیا علم اور کیا ارادہ خدا تعالےٰ کا انعام اور اس کی ہستی کی دلیل ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ ان صفات سے متصف نہیں اور خود اس نے انسان میں یہ صفات ودیعت نہیں کیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان کو یہ صفات کہاں سے حاصل ہوئیں؟

پس اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ خود شناسی خدا شناسی کا ذریعہ ہے لیکن یاد رہے کہ معرفت کا یہ پہلو انفسی لحاظ سے ہے۔ اور اگر آفاقی حیثیت سے غور کیا جائے تو ساری کائنات ہی خدا تعالیٰ کے افعال کی تجلی گاہ معلوم ہوتی ہے اور جب اس کے افعال پر نظر تدبر ڈالی جائے تو اس کی صفاتی تجلیات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور پھر صفاتی تجلیات کے مشاہدہ سے عارف کو أَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ (بقرہ آیت ۱۱۶) کی رو سے ہر طرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کا جلوہ نظر آتا ہے اور عالمین کا وجود عارف کی نگاہ میں بالکل اسی طرح محسوس ہوتا ہے جیسے صَرحٌ مُمَرَّد۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کو خدا تعالیٰ کی توحید کا سبق دینے کے

لئے ایک شیش محل بنوایا جس کا فرش بھی شیشوں کا تھا۔ جب ملکہ کو اس میں داخل ہونے کے لئے کہا گیا تو اس نے مصفّا شیشے جو پانی کی سطح کے اوپر نصب تھے انہی کو پانی سمجھ لیا اور گھبرا گئی تب سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ یعنی یہ تو محل ہے جس میں شیشے کے ٹکڑے لگائے گئے ہیں تب ملکہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اس مثال سے سمجھ گئی کہ یہ بڑے بڑے اجرام درحقیقت شفاف شیشے ہیں جن کے پیچھے خدائی طاقت کام کر رہی ہے اور ان کی پرستش کرنا غلطی ہے۔ تب اس نے نادم ہو کر کہا رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ (نمل آیت ۴۵) یعنی اے میرے رب! میں نے سورج کی پوجا کر کے اپنی جان پر ظلم کیا اور اب میں سلیمان کے ساتھ اس خدا کے حضور سر تسلیم خم کرتی ہوں جو تمام اجرام کا پروردگار ہے۔

الغرض صفاتی تجلیات کے مشاہدہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت کے جذبات عارف انسان کے قلب پر کچھ اس طرح مستولی ہوتے ہیں کہ ماسوا کا خیال ہی دل سے نکل جاتا ہے اور وہ اس محویت کے عالم میں بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ ؎

لَا اٰدَمَ فِی الْکَوْنِ وَلَا اِبْلِیْسَ
لَا مُلْکَ سُلَیْمَانَ وَلَا بِلْقِیْسَ
فَالْکُلُّ عِبَارَۃٌ وَّ اَنْتَ الْمَعْنٰی
یَا مَنْ ھُوَ لِلْقُلُوْبِ مِقْنَاطِیْسُ

یعنی نہ کوئی آدم ہے اور نہ کوئی ابلیس اور نہ کوئی سلیمان ہے اور نہ کوئی بلقیس جو کچھ ہے وہ سب بطور عبارت کے ہے۔ اور اے اپنے حسن و جمال سے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے والے خدا اس عبارت کے لئے بطور معنیٰ تیری ہی بے مثل ذات ہے۔

باقی رہا کَلَّ لِسَانُہٗ کے متعلق سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب انسان معرفت کے نتیجہ میں اپنی ہستی کو اللہ تعالیٰ کا فیضان اور عطیہ سمجھتا ہے اور حقیقت کے لحاظ سے اپنی ذات کو محض نیست اور لاشئے تو اس کی زبان خود پسندی اور خودستائی کے اظہار سے رُک جاتی ہے اور اس حالت میں جہاں وہ اپنی ذات اور وجود کی نفی کرتا ہے وہاں اپنے تعلق اور گویائی کی نفی کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔

پس یہی کَلَّ لِسَانُہٗ کا مطلب ہے۔ (۳۴)

خالق کائنات کے بارے میں غور و فکر

قرآن مجید کی بہت سی آیتیں ہیں جن میں انسان کو آسمان، سورج، چاند، ستاروں، زمین، درختوں، پہاڑوں، سمندروں،

حیوانوں اور انسانوں کی پیدائش پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور اس حیرت انگیز نظام کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ جو ان سب چیزوں میں کارفرما ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پیدائش کا کارخانہ اور وہ نظام جو دنیا کی گوناگوں سرگرمیوں کی تخلیق اور ہستی کے مقاصد کی جانب بڑھا رہا ہے بے حد حیران کن ہے۔ گندم کا دانہ یا بادام کی گٹھلی جو زمین سے اُگتی ہے ایک خوشہ دار پودا یا میوہ دار درخت بن جاتی ہے اور اس وقت سے جب وہ دانہ یا گٹھلی زمین کے پیٹ میں قرار پاتی ہے اور پھر پھٹ جاتی ہے اور اس کی سبز نوک باہر نکل آتی ہے اور سفید جڑ زمین کے دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے تک اتنی بڑی اور وسیع تنظیمیں کام کرتی ہیں۔ کہ ان کی عظمت اور وسعت دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے ستارے، چاند، سورج اور زمین سبھی اپنی محوری اور انتقالی حرکت اور پوشیدہ قوتوں کے ساتھ اور اسی طرح دانے یا گٹھلی میں رکھی گئی پر اسرار قوت، سال کے چاروں موسم، فضا کی کیفیت، بارش، ہوا، رات اور دن سبھی مل کر مثال کے طور پر گندم کے ایک پودے کی پیدائش کے سلسلے میں خدمات انجام دیتے ہیں اور اس نئے منظر کو جسے انہوں نے پرورش کے جھولے میں لٹا رکھا ہے۔ دایوں اور آیاؤں کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی جانب بڑھاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی نشو و نما کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح انسان کے ایک نومولود بچے کی پیدائش جو نباتات کے ایک نومولود یا کسی دوسرے مظہر کی پیدائش سے زیادہ پیچیدہ چیز ہے تخلیق کے پیچیدہ اور منظم کارخانے کی کروڑوں بلکہ اربوں سال کی کارگزاری کا نتیجہ ہے ایک انسان کی روزمرہ کی زندگی کا دوران تعلقات کے علاوہ جو وہ اپنے وجود سے باہر کی کائنات سے رکھتا ہے۔ اس کے وجود کے حیرت انگیز اندرونی نظام سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ دُنیا کے سائنس دان اس کی ظاہری کیفیت پر توجہ مرکوز کر کے ہر روز اس کے اسرار پر سے ایک نیا پردہ اٹھاتے ہیں لیکن ابھی تک ان کی معلومات ان حقائق کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہیں جو تاحال دریافت نہیں ہو سکے۔ لہٰذا اگر ایک شخص وہ چیزیں رکھتا ہو جو ایک طبعی انسان کے وجود کے ڈھانچے کے لئے ضروری ہیں تو وہ کامل ہوگا لیکن اگر اس میں ان میں سے کسی ایک کی کمی ہو مثلاً اگر اس کا ہاتھ یا پاؤں یا آنکھ نہ ہو تو وہ اس حد تک ناقص ہوگا۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی بنا پر کمال کی صفت وہ چیز ہے جو ہستی کی کسی ضرورت کو رفع کرے اور نقص کو دور کرے۔ مثلاً علم کی صفت جو جہالت کے اندھیرے کو دور کرتی ہے۔ اور جو چیز معلوم ہو اسے لوگوں پر واضح کرتی ہے اور قدرت کی صفت جو قدرت رکھنے والے شخص کے لئے اس کی خواہشات کا حصول ممکن بناتی ہے اور اُسے ان پر مُستلط کرتی ہے اور یہی صورت زندگی اور احاطہ وغیرہ کی صفات کی ہے۔

ہمارا وجدان (قوت تمیز) یہ کہتا ہے کہ دنیا کا پیدا کرنے والا (یعنی وہ جو دنیا اور اس میں جو کچھ ہے اس کی ہستی کا

سرچشمہ ہے اور ہر ممکن ضرورت پوری کرتا ہے اور ہر نعمت اور کمال عنایت کرتا ہے) کمال کی تمام صفات رکھتا ہے کیونکہ حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے یہ ہرگز تصور نہیں کیا جا سکتا کہ جو کوئی خود حاجت مند ہو وہ دوسروں کی حاجتیں رفع کر سکے۔

خدا بھی قرآن مجید میں کمال کی صفات کے ساتھ اپنی ستائش کرتا ہے اور اپنا تعارف ایک ایسی ہستی کے طور پر کراتا ہے جو ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ ارشاد ہوا ہے:-

یعنی فقط وہی ہے جو مطلق طور پر مالک اور بے نیاز ہے اور ہر حاجت مند کی حاجت رفع کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:-

یعنی بہترین صفات کا مالک وہ خدا ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں (وہی ہے جو زندہ، دانا، بینا، سننے والا، طاقت والا ہے، پیدا کرنے والا اور بے نیاز ہے)

لہٰذا خدا کو کمال کی صفات کا مالک اور اس کی مقدس ہستی کو ہر نقص اور عیب سے پاک سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر اس میں کوئی نقص ہوتا تو اس نقص کی بنا پر وہ ضرورت مند ہوتا اور لازم تھا کہ اس سے بھی بالاتر ایک خدا ہوتا جو اس کی ضرورت پوری کرتا۔ "سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ" (مکتب اسلام)

مخلوقاتِ خدا پر غور کرو

دنیا میں عجائبات قدرت الٰہی اس قدر ہیں کہ نہ انسان ان کا شمار کر سکتا ہے اور نہ ان کا مکمل ادراک کر سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ کارخانۂ کائنات کی حکمت اور اس کی مناسبت سمجھا سمجھا کر انسان کو بتایا گیا ہے۔ بڑے فصیح اور مؤثر انداز میں بنی نوع انسان کو اس مسئلہ پر ایمان لانے کا مکلف کیا گیا ہے۔ فلسفۂ عقلیہ دلائل و مباحث سے پُرپیچ مسائل کو عقل انسانی میں سمونے کی تدبیر و تذکیر سے کام لیا گیا۔ جس کی مثال چودہ سو سال میں کوئی پیش نہ کر سکا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

- "اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تم ہی سا جوڑا پیدا کیا۔ تاکہ اس سے دل کو چین رہے۔ اور ایک عجیب قسم کی محبت اور دل کی پگھلاہٹ تم میں رکھی۔ سمجھنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔"
- "لوگو! اگر تم کو مرنے کے بعد جی اُٹھنے میں کچھ شک ہے تو ہم نے تم کو (پہلی بار بھی تو) پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی۔ تاکہ تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کر دیں۔ اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک معیار مقرر تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر تم جوانی کو پہنچتے ہو۔ اور بعض (قبل بڑھاپا) مر جاتے ہیں۔ اور

بعض بہت خراب عمر کی طرف آجاتے ہیں۔ کہ بہت کچھ جاننے کے باوجود بھی لاعلم ہوجاتے ہیں۔ اور (اے دیکھنے والے) تو دیکھتا ہے کہ (ایک وقت میں) زمین خشک پڑی ہے۔ پھر ہم جب مینہ برساتے ہیں تو وہ شاداب ہوجاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے اور طرح طرح کی بارونق چیزیں اگتی ہیں۔ ان چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ خدا ہی برحق ہے۔ اور یہ کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

- "ان ہی نشانیوں میں سے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اب تم انسان ہو جا بجا پھیلے ہوئے۔"
- "اس کی نشانیوں میں سے بجلی بھی جس میں کڑک کا خوف اور مینہ کا طمع ہے کہ پانی برسنے سے مری ہوئی زمین زندہ ہوجاتی ہے۔"
- "آسمان سے اندازہ کے موافق مینہ برساتا ہے۔ پھر اس کو زمین میں ٹھہراتا ہے۔ پھر اس کے سبب سے تمہارے لئے باغوں میں بہت سے میوے اور کھجوریں اور انگور پیدا کرتا ہے۔ جن کو تم کھاتے ہو۔ پہاڑ میں سے درخت اگاتا ہے۔ جس سے تیل نکلتا ہے۔"
- تمہارے لئے تو جانوروں میں بھی بڑی نصیحت ہے۔ ان کی چھاتیوں میں سے جو کچھ نکلتا ہے اس کو تم پیتے ہو اور بہت سے فائدے اٹھاتے ہو۔ بعض جانور تمہارے کھانے میں آتے ہیں۔ جانور بھی تم کو اٹھائے پھرتے ہیں۔ اور کشتیاں بھی تم کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔"
- "اس نے بنائی ہے رات اور دن۔ سورج اور چاند جو اپنے اپنے دائرے میں پھرتے رہتے ہیں۔"
- بلکہ تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کس طرح دراز کرتا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو اس کو (بے حرکت) ٹھہرا دیتا۔ پھر سورج کو اس کا رہنما بنا دیا۔ پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے رات کو پردہ اور نیند کو آرام بنا دیا۔ اور دن کو اٹھ کھڑے ہونے کا وقت ٹھہرایا۔ اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت کے مینہ کے آگے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے اور ہم آسمان سے صاف ستھرا ہوا پانی برساتے ہیں۔ تاکہ اس سے شہر مردہ (یعنی بنجر زمین) کو زندہ کریں۔ پھر ہم اسے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو جو ہم نے پیدا کئے پلاتے ہیں۔"

یہ تھے چند اقتباسات جو قرآن حکیم سے ہم نے پیش کئے۔ آپ غور فرمائیں کہ قرآن میں استدلال موجود ہے کسی جگہ یہ بات نہیں کہی گئی کہ خدا وحدہٗ لاشریک پر آپ بے سمجھے ایمان لے آئیں۔ قرآن کا منشا قطعاً یہ نہیں ہے کہ وجود خالق کل کو انسان بغیر سوچے بچار کے تسلیم کرے۔ یا اس وجہ سے مان لے کہ پیغمبروں نے فرما دیا ہے۔ بلکہ صاف صاف انہی موجودات کی دلیلوں سے علم اثبات قدرتِ الٰہی کو بتا بتا کر گنا گنا کر۔ دکھلا دکھلا کر صانع عظیم کی برتری پر ایمان لانے کو کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی قرآن کے بارے میں فرمایا ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ؏ (الانبیاء۔۱۰) ترجمہ: ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔"

غرض خلقت انسان معرفت خدا

غرض بندہ کو خدا تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا ہے۔ کہ اپنی صفات کی اس پر جلوہ گری کرے جیسے آئینہ بناتے ہیں تاکہ اس میں اپنا عکس دیکھا جائے۔ اگر کوئی اس پر عکس نہ پڑنے دے۔ تو اس شخص پر کس قدر غصہ آتا ہے۔ اسی طرح خدا اور بندہ کے درمیان اگر کچھ حائل ہو تو اُسے خدا ناپسند کرتا ہے۔

بچپن میں میں نے ایک رؤیا دیکھی تھی۔ کہ میں ایک جگہ لیکچر دے رہا ہوں۔ اور یہ بیان کر رہا ہوں کہ خدا بندہ کے ساتھ اسی طرح تعلق رکھتا ہے جیسے انسان آئینہ سے۔ پھر کہتا ہوں کہ دیکھو اگر ایک شخص کا آئینہ خراب ہو جائے۔ اور وہ اس میں چہرہ دیکھنا چاہے۔ مگر چہرہ نظر نہ آئے۔ تو وہ کیا کرے گا؟ یہی کہ وہ اسے زور سے اُٹھا کر زمین پر دے مارے گا۔ اور اسے چکنا چور کر دے گا۔ اور اس وقت میں نے اپنے ہاتھ میں ایک آئینہ دیکھا جسے زور سے زمین پر دے مارا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس کے ٹوٹنے کی زور سے آواز آئی۔

میری اس خواب کی یہی تعبیر تھی کہ بندہ کا دل اللہ تعالیٰ کا آئینہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے اور بندے کے درمیان خود کسی کو کھڑا کرے اگر کوئی خود آ کھڑا ہو تو خدا تعالیٰ اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔ نبی کی اطاعت کا حکم دینے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آئینہ پر گرد ڈال دے یا اسے سیاہ کر دے ہم لوگ آئینہ ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمیں صاف کر کے خدا کے سامنے کرنے والے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے خاص قربانی اور خاص اطاعت سے اس طریق کو معلوم کر لیا ہے جس سے انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ ہمیں راستہ بتاتے ہیں۔ اور ہم ان کے پیچھے چلتے ہیں۔ لیکن شرک ایک روک ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے

معرفت خدا اور اقوام عالم

موجودہ زمانے میں روئے زمین پر بسنے والے لوگوں کی اکثریت دین دار ہے اور وہ اس خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں جس نے دنیا کو پیدا کیا ہے اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں بھی بنی نوع انسان کی یہی کیفیت رہی ہے۔ جہاں تک تاریخ بتاتی ہے زیادہ تر انسان دین دار رہے ہیں اور کائنات کے لئے ایک خدا کے قائل رہے ہیں۔ گو دین دار معاشروں میں نظریات کا اختلاف بھی موجود رہا ہے اور ہر قوم نے بعض مخصوص اوصاف خالقِ کائنات سے منسوب کیے ہیں لیکن اصلی مطلب پر سب نے اتفاق کیا ہے اور اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب مثلاً نصرانیت، یہودیت اور مجوسیت بھی اس بارے میں ہم عقیدہ ہیں۔ جو لوگ خالق کے وجود کے منکر ہیں ان کے پاس انکار کے

لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی بلکہ در حقیقت وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس خالق کے وجود کے بارے میں کوئی دلیل نہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ہم اس کے نہ ہونے کے متعلق کوئی دلیل رکھتے ہیں۔

ایک مادی انسان کہتا ہے کہ "میں نہیں جانتا"۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ "نہیں ہے"۔ دوسرے لفظوں میں ایک مادی انسان منکر نہیں بلکہ مردد ہے۔ یعنی اس کی کیفیت انکار کی نہیں بلکہ بے یقینی کی ہے۔

خداوند تعالٰی نے اپنے کلام میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

یعنی وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس دنیا ہی کی ہے جہاں ایک مرجاتا ہے اور دوسرا زندہ ہو جاتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ہم مرجاتے ہیں (اور پردے کے پیچھے کیا ہے اس کا کوئی علم نہیں)۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کا خود انہیں یقین نہیں ہے۔ (سورہ جاثیہ آیت ۲۴)

انسان کے بارے میں جو قدیم ترین آثار دریافت ہوئے ہیں ان میں بھی دین اور خدا پر عقیدے کے وجود کی نشانیاں ملی ہیں۔ اور ایسی علامتیں دستیاب ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ مابعدالطبیعیات پر عقیدہ اور ایمان رکھتے تھے حتیٰ کہ امریکہ اور آسٹریلیا جیسے نئے براعظموں اور پرانے براعظموں سے بہت دور واقع پچھلی صدی میں دریافت ہونے والے جزیروں کے مقامی باشندے بھی خدا پر ایمان رکھتے تھے اور مختلف طریقوں سے کائنات کے مبداء کی پرستش کرتے تھے حالانکہ ان کے پرانی دنیا سے رابطے کی تاریخ قطعاً دستیاب نہیں ہوئی۔

جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ انسان کا خدا پر ہمیشہ ایمان رہا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان فطری طور پر خدا کا معتقد ہے اور وہ اپنی خداداد فطرت کی بدولت کائنات کو پیدا کرنے والے خدا کے وجود کی تائید کرتا ہے۔ قرآن مجید انسان کی اس فطری خاصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اگر تم ان سے پوچھو کہ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یقیناً کہیں گے کہ خدا نے۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا کون ہے تو وہ یقیناً کہیں گے کہ "اللہ"۔

عدم معرفت خدا کا اثر

جو لوگ نفس انسانی سے مغلوب ہو کر حیوانیت کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ جن کا اندازِ فکر تبدیل ہو جاتا ہے۔ عبودیتِ الٰہی سے مائل بہ شرک ہو جاتے ہیں۔ جن کے فکر و فہم میں راست بینی اور افتاد مزاج میں راست روی نہیں رہتی۔ سیرت و کردار، خواہشات و جذبات کے تابع ہو جاتے ہیں ان پر انفرادی عذاب بھی آتے ہیں۔ مگر جب یہ خصائل عام ہو جاتے ہیں۔ اخلاق و اعمال صالح کا فقدان ہو جاتا ہے۔ چیرہ دستیوں کے مہیب سائے فرد سے افراد اور افراد سے قوم پر پڑنے لگتے ہیں۔ خدا کے قانون خلافت

میں خلاف ورزیاں سرزد ہوتی ہیں تو پھر فرد کی جگہ تمام قوم قابلِ مواخذہ ہو جاتی ہے اور اس قوم کا کوئی باشندہ بھی محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے ذاتی طور پر کوئی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اس کو اُلٹا خدائے عزوجل کے سامنے اپنی صفائی کے لئے لازماً اس امر کا ثبوت مہیا کرنا پڑے گا کہ اس نے اپنی بساط بھر اپنی استطاعت کے بموجب اصلاح عام کی کوشش کی تھی۔ حضور محمد رسول اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے :-

" اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزائیں نہیں دیتے۔ جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے ہوئے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضگی کرنے پر قادر ہوں اور پھر بھی کوئی اظہار ناراضگی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو خداوند ذوالجلال خاص و عام سب کو دکھ دینے والے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں "

یہ بات اس طرح ذہن نشین فرمایئے کہ جب کوئی وبائی مرض کسی شہر میں شدت سے پھیل جائے اور اس کے دفاعی انتظامات حسب ضرورت نہ کر لئے جائیں تو آہستہ آہستہ اس امر کی ہر ممکن توقع ہوتی ہے کہ شہر مبتلا کے چند گھر چاہے جس قدر ستھرے کیوں نہ ہوں متاثر ہو جائیں گے۔ پھر وبائی مرض یہ نہیں دیکھتا کہ ہزار خاندانوں میں سے کوئی خاندان کتنا صفا ہے۔ اس کی لپیٹ سے شاذ ہی کوئی بچتا ہے۔ اخلاقی مرضوں کا حال بھی یہی ہے۔ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور صالح سوسائٹی کی اجتماعی حالت ناقص و ابتر ہو جائے اور اخلاقی امراض کو دبانے کی قوت سوسائٹی میں ختم ہو جائے۔ تب بے حیائی فحاشی۔ بداعمالیوں۔ گمراہیوں۔ فسق و فجور۔ شرک۔ الحاد۔ زندقہ کو اعلی الاعلان اچھالنے کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور صالح افراد قلیل المقدار ہونے کی وجہ سے اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے اور سوسائٹی کی اجتماعی برائیوں پر ساکت و صامت ہو جاتے ہیں تو من حیث القوم وہ بھی اسی سوسائٹی کے فرد کی حیثیت سے اسی وبائی مرض کا شکار ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر سوسائٹی بہ الفاظ دیگر تمام قوم پر عذاب الٰہی نازل ہو جاتا ہے۔

معرفت خدا کیوں؟

(۱) **روح کی تشنگی اور مادۂ جستجو:** عالمِ ہستی کے بارے میں آگاہی اور آشنائی پیدا کرنا ہم سب کی دلی خواہش ہے ہم سب جاننا چاہتے ہیں کہ :

— یہ بلند و بالا آسمان اپنے ستاروں سمیت،

— یہ چوڑی چکلی زمین اپنے تمام دلفریب مناظر سمیت،

یہ رنگ برنگی مخلوقات، خوبصورت پرندے، سمندر میں مختلف قسم کی مچھلیاں، پھول اور شگوفے، فلک بوس درختوں کی مختلف اقسام، غرضیکہ یہ پوری کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے یا کوئی ماہر اور توانا ہاتھ اسے معرض وجود میں لایا ہے؟

ان سب سے ہٹ کر سب سے پہلا سوال جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ :-

— ہم کہاں سے آئے ؟

— کہاں ہیں ؟ اور

— کہاں جائیں گے ؟

اگر ہم ان تینوں سوالوں کا صحیح جواب پالیں تو یہ ہمارے لئے کس قدر خوش بختی کی بات ہوگی ؛ یعنی اگر ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ ہماری زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا ؟ اس کا انجام کیا ہوگا ؛ اور اس وقت ہمارا کیا فریضہ ہے ؟

جستجو اور تلاش کا مادہ ہمیں کہتا ہے کہ جب تک ان سوالات کے جواب نہ پالیں آرام سے نہ بیٹھیں۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ٹریفک کے حادثے میں کوئی شخص مجروح اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ معالجے کے لئے اسے ہسپتال لے آتے ہیں۔ جب اسے غشی سے تھوڑا سا افاقہ ہوتا ہے اور وہ ہوش میں آتا ہے تو اپنے اطراف والوں سے سب سے پہلا سوال یہ کرتا ہے کہ یہ کونسی جگہ ہے ؟ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے ؟ اور کب میں یہاں سے جاؤں گا ؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے سوالات کے بارے میں انسان خاموش نہیں رہ سکتا۔

یعنی سب سے پہلی چیز جو ہمیں خدا کی تلاش اور عالمین کے پیدا کرنے والے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے وہ روح کی تشنگی اور مادہ جستجو ہے۔ (آسان عقائد)

غرض خلقت انسان معرفت خدا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے لِیَعْبُدُوْنِ کی تفسیر لِیَعْرِفُوْنَ سے فرمائی ہے اور صاحبِ جلالین نے اپنی تفسیر جلالین میں اسی کو لیا ہے پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتا دیا کہ ہم نے جن اور انسان کو اپنی معرفت و پہچان کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ ایک حدیث قدسی سے اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے ۔ کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ حدیثِ قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جن کو حق تعالیٰ نے فرمایا ہو اور راوی اس کے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں ایک خزانہ مخفی تھا پس مجھے یہ بات بھلی معلوم ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

اسی آیت کریمہ کو حضرت عارف رومیؒ نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے ؎

ماخلقت الجن والانس ایں بخواں　　　جز عبادت نیست مقصود از جہاں

مولانا رومیؒ حق تعالیٰ کی طرف سے حکایت فرماتے ہیں کہ میں نے جن اور انس کو اپنی عبادت کے لئے یعنی معرفت کے لئے پیدا فرمایا ہے اور جن اور انسان کی تربیت یعنی پرورش کے لئے اور ان کی حیات کی حفاظت اور بقا کے لئے یہ ساری کائنات پیدا کی گئی۔ (معرفت الٰہیہ)

قرآنی دعوت عقل و فکر

قرآن کے طریق استدلال کا اوّلین مبدء تعقل و تفکر کی دعوت ہے، یعنی وہ جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لئے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر جو کچھ بھی محسوس کر سکتا ہے، اس میں تدبر و تفکر کرے۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورۃ اور سورۃ کا کوئی حصہ نہیں جو تفکر و تعقل کی دعوت سے خالی ہو۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (۵۱: ۲۰-۲۱)	اور یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں بھی (معرفت حق کی) نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں۔

وہ کہتا ہے: انسان کو عقل و بصیرت دی گئی ہے، اس لئے وہ اس قوت کے ٹھیک استعمال کرنے نہ کرنے کے لئے جواب دہ ہے۔

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا	یقیناً (انسان کا) سننا، دیکھنا، سوچنا، سب اپنی اپنی جگہ جواب دہی رکھتے ہیں (۱۷: ۳۶)

وہ کہتا ہے: زمین کی ہر چیز میں، آسمان کے ہر منظر میں، زندگی کے ہر تغیر میں، فکر انسانی کے لئے معرفت حقیقت کی نشانیاں ہیں، بشرطیکہ وہ غفلت و اعراض میں مبتلا نہ ہو جائے۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ (۱۲: ۱۰۵)	اور آسمان و زمین میں (معرفت حق کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر!) لوگ ان پر سے گزر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے تک نہیں

اچھا! اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے اور کائنات خلقت میں تفکر کرے تو اس پر حقیقت شناسی کا کونسا دروازہ کھلے گا؟ وہ کہتا ہے: سب سے پہلی حقیقت جو اس کے سامنے نمودار ہوگی وہ تخلیق بالحق کا عالم گیر اور بنیادی قانون ہے یعنی وہ دیکھے گا کہ کائنات خلقت اور اس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور کوئی شے نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ سب کچھ تخلیق بالباطل ہو، یعنی بغیر کسی معین اور ٹھیرائے ہوئے مقصد و نظم کے وجود میں آگیا ہو، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس نظم، اس یکسانیت، اس دقت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے ساتھ بندھی ہوتی ہوتی (۱۹):

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۲۹ : ۴۴)

اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور بلاشبہ اس بات میں ارباب ایمان کیلئے (معرفت حق کی) ایک بڑی ہی نشانی ہے!

"آل عمران" کی مشہور آیت میں ان ارباب دانش کی جو آسمان و زمین کی خلقت میں تفکر کرتے ہیں، صدائے حال یہ بتائی ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۝ (۳ : ۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے اس لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ محض ایک بے کار و عبث سا کام ہو۔

دوسری جگہ "تخلیق بالباطل" کو تلعب سے تعبیر کیا ہے (۲۰) "تلعب" یعنی کوئی کام کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدعا کے کرنا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۴۴ : ۳۸ — ۳۹)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، محض کھیل اور تماشہ کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا ہے ہم نے انہیں نہیں پیدا کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

پھر جابجا اس "تخلیق بالحق" کی تشریح کی ہے، مثلاً ایک مقام پر "تخلیق بالحق" کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ و فیضان کے لئے ہے اور فطرت چاہتی ہے کہ جو کچھ بنائے، اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لئے نفع اور راحت ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ۝ (۳۹ : ۵)

اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس نے رات اور دن کے اختلاف اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹا آتا ہے اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے۔ سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کے لئے گردش کر رہے ہیں۔ (سنو! وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔ (۲۱))

ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اجرام سماویہ کے افادہ فیضان پر توجہ دلائی ہے اور اسے "تخلیق بالحق"

سے تعبیر کیا ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ط مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ (۱۰:۵)

وہ (کارفرمائے قدرت) جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا اور پھر چاند کی گردش کے لئے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور (اوقات کا) حساب معلوم کر لو۔ بلاشبہ اللہ نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ، وہ ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں، (علم و معرفت کی) نشانیاں الگ الگ کر کے واضح کر دیتا ہے۔

ایک اور موقع پر فطرت کے جمال و زیبائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے، یعنی فطرت کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے جو کچھ بنے، ایسا بنے کہ اس میں حسن و جمال اور خوبی و کمال ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۶۴:۳)

اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بنائیں۔

اسی طرح وہ قانون مجازات پر (یعنی جزاء و سزا کے قانون پر) بھی اسی "تخلیق بالحق" سے استشہاد کرتا ہے تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ اور نتیجہ رکھتی ہے۔ اور تمام خواص اور نتائج لازمی اور اٹل ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال میں بھی اچھے اور برے خواص اور نتائج نہ ہوں اور وہ قطعی اور اٹل نہ ہوں جو قانون فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے برے کا امتیاز رکھتا ہے کیا انسان کے اعمال میں امتیاز سے غافل ہو جائے گا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ○ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں یعنی دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی۔ (اگر ان لوگوں کے فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے تو) کیا ہی برا ان کا فیصلہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و مصلحت

هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۴۵ : ۲۱-۲۲) کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلا پالے اور ایسا نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو

معاد، یعنی مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اس سے جا بجا استشہاد کیا ہے۔ کائنات میں ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ رکھتی ہے، پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لئے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو۔ یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے، کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کائنات ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اسی لئے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر فنا ہو جائے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ○ (۳۰ : ۸)

کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، محض بے کار وعبث نہیں بنایا ہے ضروری ہے کہ حکمت ومصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لئے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔

مبدء استدلال غرض کہ قرآن کا مبدء استدلال یہ ہے کہ:-

(۱) اس کے نزول کے وقت دین داری اور خدا پرستی کے جس قدر عام تصورات موجود تھے۔ وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے، بلکہ ان کی تمام تر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ لیکن اس نے خدا پرستی کے لئے عقلی تصور پیدا کیا۔

(۲) اس کی دعوت کی تمام تر بنیاد تعقل وتفکر پر ہے اور وہ خصوصیت کے ساتھ کائنات خلقت کے مطالعہ وتفکر کی دعوت دیتا ہے۔

(۳) وہ کہتا ہے، کائنات خلقت کے مطالعہ وتفکر سے انسان پر تخلیق بالحق کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے یعنی وہ دیکھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو اور کسی بالاتر قانون خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی ہو۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلے میں بندھی ہوئی ہے۔

(۴) وہ کہتا ہے: جب انسان ان مقاصد ومصالح پر غور کرے گا تو عرفان حقیقت کی راہ خود بخود اس پر کھل جائے گی۔ اور جہل وکوری کی گم راہیوں سے نجات پا جائے گا۔

(ترجمان القرآن)

قرآن کا مطالعہ فرمائیے۔ آپ کو اس میں ایسی کوئی بات نہ ملے گی جو آپ کو خواہ مخواہ خدا کو قادرِ مطلق تسلیم کرنے پر مجبور کر دے۔ اس کی بجائے وانشگاف الفاظ میں انسان کو غور و فکر۔ تذکیر و تدبیر۔ عقل و البصیرت کے دروازے کھول کر سمجھنے کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآن کے بیانات کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ کہ یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔ (يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ) ایسا ہی طرزِ تکلم اور استدلال آپ کو جگہ جگہ قرآن حکیم میں ملے گا ملاحظہ فرمائیے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (تاکہ تم سمجھو) لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (تاکہ تم سوچو) اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (تم سوچتے کیوں نہیں) اَفَلَا تَشْكُرُوْنَ (تم شکر کیوں نہیں کرتے) ایسی دعوتِ سیر و فکر ایسا التزام مشاہدات۔ ایسا انشراح صواب کس بات کی دلالت کرتا ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی! دنیاوی علوم و فنون میں کمال کا شمار بھی خدا تعالیٰ کی نعمتوں میں ہی سے ہے۔ تمدن و معاشرہ کی پیدا کی ہوئی عیش پرستیوں میں پڑ کر خوفِ آخرت سے بے فکر و بے نیاز ہو جانا۔ قانونِ قدرت کی حدود کو توڑ کر فسق و فجور میں خود کو ڈال دینا۔ خدا کی عظمت، ربوبیت اور انسان کی عبودیت کو فراموش کر دینے پر خدا اپنی مخلوق "انسان" سے جس کو اشرف المخلوقات ہونے پر فخر ہے اور خلیفۃ الارض کہنے پر فرحاں ہے۔ کیا قطعی باز پرس نہ کرے گا؟ کیا کسی قسم کا مواخذہ نہ کیا جائے گا؟ کیا کسی قسم کی جواب طلبی نہ کی جائے گی۔ یہ آپ کی بھول ہے۔ ضرور ایسا ہو گا! جب ہر آقا اپنے غلام یا ملازم سے باز پرس کرتا ہے۔ تو کیا آپ کا مالک آپ سے باز پرس نہ کرے گا ع

این خیال است و محال است جنوں (۳۷)

قرآن کریم مختلف طریقوں سے عام لوگوں کو خداشناسی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ان کے افکار کو دنیا کی آفرینش اور اس نظام کی طرف متوجہ کراتا ہے جو اس دنیا میں حکومت کر رہا ہے (جاری و ساری ہے) اور پھر انفس و آفاق کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے، کیونکہ انسان اپنی چند روزہ زندگی میں جو راستہ یا طریقہ بھی اختیار کرے یا جس حالت میں زندگی گزارے، وہ دنیائے فطرت اور اس میں موجودہ نظام کی حکومت سے ہرگز باہر نہیں نکل جا سکتا اور اس کا شعور و ادراک، زمین و آسمان کے عجیب و غریب مناظر کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔

یہ وسیع جہانِ ہستی (نظامِ کائنات) جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے (جیسا کہ ہم جانتے ہیں) اس کا ہر ایک جزو اور ذرہ کلی طور پر ہمیشہ تغیر و تبدل کا شکار رہے اور ہر لحظہ اس کی شکل و صورت دگرگوں ہو کر ایک نیا روپ دھار لیتی ہے جو پہلے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

اور پھر قوانین کے زیرِ اثر جس میں استثنا موجود نہیں ہے، حقیقت اور اثبات کا لباس پہن لیتی ہے اور

اسی طرح بہت بلند اور دور کہکشانوں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ذرے تک جن سے اس جہاں کی تشکیل و تکمیل ہوئی ہے، ہر چیز ایک خاص اور واضح نظام میں حرکت کرتی ہے اور اپنے قوانین کے ذریعے جس میں کسی قسم کی استثنار موجود نہیں ہے، بڑے حیرت انگیز طریقے سے یہ ساری چیزیں اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ سب اشیار اپنے دائرہ عمل کو بہت ہی پست اور نچلی سطح سے مکمل ترین حالت کی طرف بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ تکمیل کے مرحلے تک پہنچ جاتی ہیں۔

اور خصوصی نظاموں، عمومی نظاموں اور آخر کار عام دنیادی نظام سے بالاتر جن کے بے شمار اجزاء ایک دوسرے کو آپس میں مربوط کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے نظاموں کو آپس میں ملاتے ہیں اور اپنی دائمی حرکت میں ہرگز کسی استثنار کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی ان نظاموں میں کسی قسم کی ہرج و مرج پیدا ہوتی ہے۔

مثلاً اگر فطرت کا نظام انسان کو زمین میں جگہ دیتا ہے تو اس زمین کے وجودی ڈھانچے کو اس طرح ترکیب (مختلف اجزار کا مجموعہ) دیتا ہے کہ اس کی زندگی اور ماحول کے ساتھ سازگار ہو اور پھر اس زندگی اور ماحول کو اس طرح بناتا ہے کہ ایک مہربان دایہ کی طرح مہر و محبت کے ساتھ اس کی پرورش کرتے ہوئے کائنات کی ہر چیز مثلاً سورج، چاند ستارے، پانی، مٹی، دن، رات، سال کے موسموں، بادل، ہوا، بارش، زمین کے نیچے اور زمین کے اوپر موجود ذخائر اور خزانے اور آخر کار اپنی قدرت اور طاقت کے تمام وسائل اور سرمائے کو اس کے آرام و آسائش کی خاطر کام پر لگائے رکھتا ہے۔ ہم ایسے رابطے اور تعلق کو دنیا کے ہر مظہر اور اس کے اردگرد اور ہمسایہ چیزوں کے درمیان مشاہدہ کرتے ہیں، یعنی دنیا کے تمام مظاہر، جن میں انسان زندگی گزارتا ہے، آپس میں مربوط ہیں۔

کائنات کے ہر مظہر کے داخلی نظام میں بھی اس قسم کا تعلق اور رابطہ موجود اور ظاہر ہے۔ اگر فطرت نے انسان کے لئے روٹی مہیا کی ہے تو اس کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ اور کھانے کے لئے منہ اور چبانے کے لئے دانت بھی دیئے ہیں اور ان تمام چیزوں کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک قسم کے منظم ذرائع کے ساتھ آپس میں مرتبط کر رکھا ہے۔ یعنی ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے (بقا اور کمال)

دنیا کے ماہرین اور دانشور اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رکھتے کہ وہ بے شمار تجربے، جو انہوں نے اپنی چند ہزار سالہ علمی کاوشوں کے ذریعے حاصل کئے ہیں وہ فطرت اور کائنات کے اسرار میں سے ایک بہت ہی معمولی جلوہ ہیں، جس کے پیچھے ایک بہت ہی طویل اور بے انتہا سلسلہ موجود ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے ہر تازہ انکشاف انسان کے سامنے بے شمار مجہولات (جن چیزوں کا علم نہ ہو) لے آتا ہے (جس میں انسان گم ہو کر رہ جاتا ہے)

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وسیع جہانِ ہستی (کائنات) جس کے تمام اجزاء الگ الگ ہوتے ہوئے بھی آپس میں

ایک مضبوط اتحاد اور وحدت و اتصال اور حیرت انگیز اتفاق رکھتے ہیں اور یہ سب ایک لامتناہی طاقت اور علم کو بیان کرتے ہیں، ان کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے؟ اور یہ سب کچھ اپنے آپ، عبث اور فضول پیدا ہو گیا ہے۔

آیا یہ جزئی اور کلی نظامات اور آخر کار دنیا کا عمومی نظام، جس نے دنیا کے لاانتہا اجزاء کو آپس میں مربوط اور مستقل کر کے ایک بڑا متحدہ کائناتی (ONE UNIT UNIVERSAL SYSTEM) بنا دیا ہے، اپنے منظم قوانین کے ساتھ جس میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے، ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ کیا یہ سب کچھ بغیر کسی نقشے کے اتفاقیہ طور پر بن گیا ہے؟ یا ان میں سے ہر ایک مظہر اور کائنات کے چھوٹے بڑے ماحول نے اپنی پیدائش سے پہلے ہی اپنے لئے ایک خاص نظام اور طریقہ انتخاب کر لیا ہے؟ اور اپنی پیدائش کے بعد اس نظام کو خاص موقع و محل کے مطابق نافذ اور جاری کرتا ہے۔

البتہ وہ انسان جو ہر حادثے، واقعے اور مظہر کو ایک علت اور سبب حادثے سے منسوب کرتا ہے اور کبھی کبھی ایک مجہول سبب اور علت کو پیدا کرنے کے لئے مدتوں بحث، کوشش اور جستجو میں گزار دیتا ہے اور کبھی کبھی علمی کامیابیوں کے پیچھے چکر لگاتا رہتا ہے، وہ انسان جوان چند اینٹوں کو دیکھ کر جو بڑی ترتیب کیساتھ ایک دوسری کے اوپر نیچے رکھی گئی ہوں، اس کو ایک طاقت اور علم کے ساتھ منسوب کرتا ہے اور اس میں ہر قسم کے اتفاق اور حادثے کی نفی کرتے ہوئے اس کو ایک نقشے اور مقصد کا نتیجہ سمجھتا ہے، وہ ہرگز اس بات پر تیار نہیں ہوگا کہ اس کائنات اور جان ہستی کی پیدائش کو بے سبب اور بے علت سمجھے یا دنیا کے نظام کو ایک اتفاقیہ طور خیال کرے۔

پس یہ جہان اور کائنات ایک خاص نظام کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں اور وہی نظام اس میں حکومت کرتا ہے اور اس کا پیدا کرنے والا بہت ہی عظیم ہے، جس نے اپنے بیکراں اور ختم نہ ہونے والے علم اور طاقت کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اور اس کو ایک خاص نہج اور طریقے یا ہدف کی طرف چلا رہا ہے اور وہ وقتی اور چھوٹے چھوٹے حوادث اور بعض دوسرے اتفاقات جو اس جہان میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ سب حالات و واقعات اسی نکتے تک پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں ہر طرف سے اسی (خدا) کی تسخیر اور احاطے میں واقع ہیں۔ ہر چیز اپنی زندگی میں اسی (پروردگار) کی محتاج ہے اور وہ کسی چیز کا محتاج یا نیازمند نہیں ہے اور اس کا کوئی منبع یا سرچشمہ نہیں ہے (نہ کسی کو اس نے پیدا کیا اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ (لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ) (شیعہ)

معرفتِ الٰہیہ کی قرآنی تعلیم

قرآن مجید نوع انسان کو مختلف طریقوں سے معرفتِ الٰہی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ بالخصوص انہیں دنیا کی تخلیق اور اس پر حاوی نظام کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ موجوداتِ دنیا اور "اپنے نفسوں" کے بارے میں غور و فکر کریں۔ کیونکہ اپنی چند روزہ دنیاوی زندگی میں انسان خواہ کوئی راستہ اختیار کرے یا کسی حالت میں بھی ہو عالم ہستی یا اس پر حاوی نظام سے باہر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی عقل اور قوت ادراک آسمان اور زمین کے ان عجیب و غریب نظاروں کو نظر انداز نہیں کر سکتیں جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ وسیع عالم ہستی جو ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ پورے کا پورا اور اس کے تمام اجزا مسلسل تغیر و تبدل کی حالت میں ہیں۔ یہ ہر لحظہ اپنے آپ کو ایک نئی اور انوکھی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ ان قوانین کے زیر اثر حقیقت کا روپ دھارتا ہے جن میں کوئی استثناء نہیں۔ بعید ترین کہکشاؤں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ذروں تک جو اس کائنات کے اجزاء ہیں مخلوق کا ہر حصہ ایک اندرونی نظام رکھتا ہے جو حیرت انگیز طریقے پر ایسے قوانین کے تحت چلتا ہے جن میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ دنیا اپنا دائرہ کار پست ترین حالت سے کامل ترین حالت تک وسیع کرتی ہے اور خود اپنے کمال کی منزل تک پہنچتی ہے۔

ان نظاموں سے بالاتر زیادہ عالمگیر نظام ہیں اور بالآخر مجموعی کائناتی نظام ہے جو دنیا کے لاتعداد حصوں کو یکجا کرتا ہے اور مخصوص نظاموں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔ یہ نظام مسلسل جاری ہے اور کسی استثناء یا خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیتا۔

تخلیق کا نظام ایسا ہے کہ مثال کے طور پر اگر وہ کسی شخص کو زمین پر وارد کرتا ہے تو اسے ایسی بناوٹ عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے ماحول میں خوش اسلوبی سے رہ سکے۔ وہ ماحول کو یوں ترتیب دیتا ہے کہ وہ اس شخص کی پرورش ایک مہربان دایا کی طرح کرتا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پانی، زمین، رات، دن، سال کے مختلف موسم، بادل، ہوا، بارش، زمین کی سطح پر بکھرے ہوئے اور اس کے اندر چھپے ہوئے خزانے غرضیکہ فطرت کی تمام قوتیں اس شخص کی بہبود اور تسکین خاطر کے لئے سرگرم عمل ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کی یگانگت اور ہم آہنگی مظاہر کے درمیان اور خود اس کے گھر میں موجود ہوتی ہے۔

اس قسم کا تسلسل اور ہم آہنگی دنیا کے ہر مظہر کی اندرونی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر تخلیق نے انسان کو خوراک عنایت کی ہے تو اسے وہ خوراک تلاش کرنے کے لئے پاؤں، پکڑنے کے لئے ہاتھ، کھانے کے لئے منہ اور چبانے کے لئے دانت دیئے ہیں۔ اس نے متعدد ذریعوں سے جو ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح

ایک دوسرے سے وابستہ ہیں انسان کو تخلیق کے آخری مقصد سے منسلک کر دیا ہے جو کہ تقالور کمال ہے۔
بہت سے سائنسدانوں کو اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ہزاروں سال کی کاوش کے بعد مختلف اشیاء کے مابین جو لاتعداد تعلقات ظاہر کئے ہیں۔ وہ کائنات کے اسرار اور ان کی بے شمار پیچیدگیوں کی ابتدائی کیفیت کے محض ادنیٰ نمونے ہیں۔ ہر نیا انکشاف انسان کو لاتعداد نامعلوم عناصر کی موجودگی کی خبر دیتا ہے۔
کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ وسیع کائنات جس کے مختلف حصے علیحدہ علیحدہ اور مجموعی طور پر اور ایک دوسرے سے باہمی تعلقات کی بنا پر لامتناہی علم اور قوت کا پتہ دیتے ہیں کسی خالق کے بغیر اور بلا وجہ پیدا ہو گئی ہے؟ اور کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مخصوص اور عالمگیر نظام اور پھر یہ پورا کائناتی نظام جس نے باہمی گوناگوں تعلقات پیدا کر کے کائنات کو ایک وحدت کی شکل دے رکھی ہے، کسی منصوبے اور تدبیر کے بغیر محض اتفاق سے وجود میں آ گئے ہیں؟ یا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کائنات کے مظہر نے وجود میں آنے سے پہلے اپنے لئے ایک نظام اور ایک قانون کا انتخاب کر لیا تھا جس پر وہ وجود میں آنے کے بعد عمل درآمد کرتا ہے؟ یا کوئی یہ دعوے کر سکتا ہے کہ یہ دنیا جو ایک وحدت ہے اور جس کے اجزاء میں مکمل یگانگت، ہم آہنگی اور وابستگی پائی جاتی ہے۔ مختلف ذرائع سے دیئے گئے مختلف احکام کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے؟
ظاہر ہے کہ ایک باشعور انسان جو ہر واقعے اور مظہر کا رشتہ ایک سبب سے جوڑتا ہو اور جو بعض اوقات ایک ایسا سبب دریافت کرنے کے لئے جس کا اسے علم نہ ہو کافی تحقیق اور تفتیش کرتا ہو کبھی بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ دنیا ایک ایسی ہستی کے بغیر جو اس کا سبب ہو خود بخود پیدا ہو گئی ہو۔ ایسا شخص جب چند اینٹوں کو ایک دوسری پر ترتیب سے رکھے دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ یہ کسی علم اور قوت کے حامل شخص نے رکھی ہیں اور ان کا پہلے سے طے شدہ کوئی مقصد ہے لہٰذا وہ کائنات کے وسیع نظام کو محض اتفاق کا نتیجہ نہیں سمجھ سکتا۔
دنیا پر حاوی نظام کے گہرے مطالعہ سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کا نظام ایک قادر مطلق نے پیدا کیا ہے جو لامحدود علم اور طاقت رکھتا ہے اور اس دنیا کی رہنمائی ایک مقصد کی جانب کرتا ہے وہ جزدی کاب جو دنیا میں انفرادی واقعات وجود میں لاتے ہیں بالآخر اسی تک پہنچ کر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے اسی کے زیر تسلط ہوتے ہیں اور اسی کی دانش سے ہدایت پاتے ہیں۔ ہر موجود اس کا محتاج ہے جبکہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور کسی طرح کے اسباب یا حالات کا سہارا نہیں لیتا۔
خداوند کریم فرماتا ہے :-
"بے شک آسمان اور زمین میں ایمان والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں اور تمام جانوروں میں جو

وہ (اللہ) زمین پر پھیلا تا رہتا ہے یقین کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں اور رات دن کے آنے میں جو رزق (پانی) اللہ نے آسمان سے نازل فرمایا اور اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کیا اور ہواؤں کے چلانے میں عقلمند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک پڑھتے ہیں تو اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔" (سورۂ جاثیہ۔ آیات ۴ تا ۶)

اس دنیا کی ہر وہ حقیقت جس کا ہم ممکنہ طور پر تصور کر سکتے ہیں۔ ایک محدود حقیقت ہوتی ہے جس کی واقعیت کا انحصار چند لازمی اسباب اور حالات پر ہوتا ہے۔ اگر وہ حالات اور اسباب موجود نہ ہوں تو وہ حقیقت دنیا میں موجود نہیں ہو سکتی۔ ہر حقیقت کی ایک حد ہوتی ہے جس سے آگے وہ اپنی ہستی کو نہیں بڑھا سکتی۔ فقط اللہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں۔ اس کی حقیقت کامل ہے اور خواہ ہم کسی طرح بھی اس کا تصور کرنے کی کوشش کریں اس کی ذات لامتناہی ہے۔ اس کی ہستی کسی چیز پر تکیہ نہیں کرتی اور کوئی اسباب یا حالات ایسے نہیں جن کی اسے حاجت ہو۔ ظاہر ہے کہ جو چیز لامحدود ہو اس کے بارے میں ہم کثرت کا خیال بھی نہیں کر سکتے کیونکہ بالفرض اگر ہم کسی دوسری حقیقت کا خیال کریں گے تو وہ پہلی سے مختلف ہوگی جس کے نتیجے میں دونوں محدود ہو جائیں گی۔ مثلاً اگر ہم ایک لامحدود جسامت کا قیاس کریں تو پھر ہم اس کے ساتھ ساتھ ایک اور نامحدود جسامت کا قیاس نہیں کر سکتے اور اگر ہم ایک دوسری لامحدود جسامت فرض کریں تو وہ پہلی ہی ہوگی۔ پس اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہم پہلے اس بدوی کا ذکر کر چکے ہیں جس نے عین اس وقت جب جنگ جمل زوروں پر تھی حضرت علیؑ سے سوال کیا کہ کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ایک ہے؟ جواب میں حضرت علیؑ نے فرمایا:

"اگر یہ کہا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کے چار معنی ہیں۔ ان میں سے دو معنی باطل ہیں اور دو درست ہیں۔ جو دو معنی باطل ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب انسان یہ کہے کہ اللہ ایک ہے تو وہ اعداد اور گنتی کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ یہ معنی باطل ہیں کیونکہ جس کا کوئی دوسرا نہ ہو وہ اعداد کے زمرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں نے کہا اللہ تین میں سے ایک ہے (یعنی نصرانی) وہ کفر میں مبتلا ہو گئے۔ ایک اور معنی یہ ہیں کہ کوئی کہے کہ فلاں شخص ان لوگوں میں سے ہے یعنی اس جنس کی ایک نوع ہے یا ایک نوع کا ایک فرد ہے جب اس معنی کا اللہ پر اطلاق کیا جائے تو یہ معنی بھی درست نہیں کیونکہ اس سے مراد کسی چیز سے اللہ کی مشابہت کے ہیں اور اللہ ہر شباہت سے بالاتر ہے۔ جہاں تک ان دو معانی کا تعلق ہے جن کا اطلاق اگر اللہ تعالےٰ پر کیا جائے تو وہ درست ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کو اس معنی میں ایک مانا جائے کہ اشیاء میں سے کوئی بھی اس سے مشابہ نہیں ہے۔ اللہ ان معنوں میں بے مثل ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ ان معنوں میں ایک ہے

کہ کیا ظاہر اطوار پر اور کیا دل میں یا تصور میں اس کی کثرت یا تقسیم کے بارے میں قیاس تک نہیں کیا جاسکتا اللہ اس یکتائی کا مالک ہے۔"

حضرت علیؑ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"اللہ کی معرفت اس کی توحید کی معرفت ہے۔"

اس سے مراد یہ ہے کہ جب یہ ثابت کر دیا جائے کہ اللہ کی ہستی لامحدود ہے تو یہ اس کی توحید کا کافی ثبوت ہے کیونکہ ایک لامحدود ہستی کے مثل کا قیاس کرنا ناممکن ہے لہٰذا گو اللہ کی توحید کے اور بھی کئی ثبوت ہیں لیکن انہیں پیش کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔

معرفت کے بارے میں قرآن مجید اور سنت کی مہیا کردہ رہنمائی

خداوند عالم نے قرآن مجید میں انسان کو کئی جگہ حکم دیا ہے کہ کتاب اللہ میں غور کرے اور یہ کوشش جاری رکھے اور اس کے مندرجات کو محض سطحی طور پر سمجھنے پر اکتفا نہ کرے۔ بہت سی آیات میں کائنات اور تمام تر مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں (آیات) قرار دیا گیا ہے۔ 'آیت' اور 'نشانی' کے الفاظ کے معانی کے بارے میں غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ مختلف اشیاء کو یہ نام اس لئے دیئے گئے ہیں کہ یہ خود اپنے آپ کو اس قدر ظاہر نہیں کرتیں جتنی اپنے علاوہ ایک اور حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً جب انسان ایک دفعہ سرخ روشنی کو خطرے کے نشان کے طور پر دیکھ لیتا ہے تو پھر اس کے دماغ پر خطرے کا خیال چھا جاتا ہے اور وہ سرخ روشنی پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اگر وہ روشنی کی شکل ـــ ماہیت اور رنگ کی طرف توجہ دینے لگے تو پھر اس کے دماغ میں خطرے کا تصور پیدا ہو جانے کی بجائے بتی کی طرح ـــ اس کے شیشے اور رنگ کا تصور پیدا ہو گا۔ اسی طرح اگر کائنات اور اس کے مظاہر ہر لحاظ سے خالق کائنات کی نشانیاں ہیں تو پھر وہ آزاد وجود کے حامل نہیں ہیں۔ ہم خواہ انہیں کسی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں وہ اللہ کے سوا کسی چیز کی طرف نشاندہی نہیں کرتیں۔ جو شخص قرآن مجید کے زیر ہدایت دنیا اور اہل دنیا کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھے وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا ادراک نہیں کرتا۔ اس مستعار حسن کو دیکھنے کی بجائے جسے لوگ دنیا کے دلکش خدوخال میں دیکھتے ہیں وہ ایک بے پایاں حسن کو دیکھتا ہے۔ وہ ایک ایسے محبوب کو دیکھتا ہے جو اپنا جلوہ دنیا کی تنگنائے سے دکھاتا ہے۔ بلاشبہ جیسا کہ سرخ روشنی کی مثال میں بتایا گیا ہے جو چیز نشانیوں میں دیکھی جاتی ہے وہ دنیا نہیں بلکہ دنیا کے خالق کی ذات ہے۔ ایک خاص نقطۂ نگاہ سے اللہ اور دنیا کے مابین رشتہ (۱+۱) یا (۱×۱) کا نہیں بلکہ (۱+۰) کا ہے (جس سے مراد یہ ہے کہ دنیا اللہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور اس کی ذات میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتی)۔

جونہی انسان کے دل میں اس حقیقت کا شعور پیدا ہوتا ہے تو اپنی علیحدہ ہستی کا پندار ٹوٹ جاتا ہے اور اچانک اس کے دل میں اللہ تعالےٰ کی محبت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ شعور آنکھ، کان یا دوسرے ظاہری حواس کی بدولت یا تخیل یا دماغ کی قوت کے ذریعے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمام اعضاء بجائے خود نشانیاں ہیں اور جس روحانی ہدایت کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ اس کے لئے ان کی کوئی حیثیت نہیں[1]

جس شخص کی رسائی جلوۂ الٰہی تک ہو اور جو فقط اللہ کو یاد رکھنا چاہتا ہو اور باقی سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہو جب وہ یہ سنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر فرماتا ہے:۔

"اے ایمان والو! تم اپنے نفسوں کے خود ذمہ دار ہو۔ اگر تم راہِ راست پر ہو تو کوئی گمراہ شخص تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" (سورۂ مائدہ - آیت ۱۰۵)

تو پھر وہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ واحد شاہراہ جو اس کی مکمل رہنمائی کر سکتی ہے، "خود شناسی" کی شاہراہ ہے اس کا سچا رہنما جو خود اللہ تعالےٰ ہے اسے اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سمجھے۔ تمام دوسرے راستے چھوڑ کر خود شناسی کا راستہ تلاش کرے، اللہ تعالےٰ کو اپنی روح کے دریچے سے دیکھے اور یوں اپنی تلاش کا حقیقی مقصد پا لے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"[2]

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"تم میں سے وہ لوگ اللہ کو بہتر پہچانتے ہیں جو اپنے آپ کو بہتر پہچانتے ہیں۔"[3]

جہاں تک سیر و سلوک کا یہ راستہ اختیار کرنے کا تعلق ہے قرآن مجید کی بہت سے آیات میں جو اللہ تعالےٰ کو یاد رکھنے کی تاکید کرتی ہیں، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔

"مجھے یاد کرو اور پھر میں بھی تمہیں یاد کروں گا۔" (سورۂ بقرہ - آیت ۱۵۲)

انسان کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ نیک اعمال کرے جن کی وضاحت قرآن مجید اور حدیث میں کر دی گئی ہے۔ نیک اعمال

---

[1] حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:۔

"خدا وہ نہیں جو علم کے احاطے میں آجائے۔ خدا وہ ہے جو دلیل کی راہنمائی اپنی جانب کرتا ہے"
(بحار الانوار - جلد ۲ - صفحہ ۱۸۶)

[2] ایک معروف حدیث جس کی سُنی اور شیعہ صوفیاء اور عرفاء کی کتابوں میں بالخصوص تکرار کی گئی ہے۔

[3] یہ حدیث بھی شیعہ اور سنی عرفاء کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔ (ناشر)

کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"بے شک تمہارے لئے اللہ کا رسول بہترین نمونہ ہے۔" (سورۂ احزاب۔ آیت ۲۱)

یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام ایک مخصوص راہ کو وہ راہ قرار دے جو اللہ کی طرف لے جاتی ہے جب تک وہ تمام لوگوں کو اس راہ سے متعارف نہ کرا دے؟ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس راہ کے بارے میں بتلائے لیکن یہ وضاحت نہ کرے کہ اس پر چلنے کا کیا طریقہ ہے؟

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"اے رسولؐ! ہم نے تم پر کتاب (قرآن) نازل کی جس میں دین اور دنیا کا واضح طور پر بیان ہے۔"

(سورۂ نحل۔ آیت ۸۹) (پاسداران اسلام)

معرفت خدا اور قرآن

جب کوئی شیر خوار بچہ دونوں ہاتھوں سے اپنی ماں کا پستان پکڑ کر دودھ پینے کے لئے چوستا ہے تو وہ درحقیقت دودھ پینا چاہتا ہے اور اگر کوئی چیز اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اسے کھانے کے لئے اپنے منہ کی طرف لے جاتا ہے تو اس کا اصلی مقصد کھانا ہوتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ اسے مغالطہ ہوا ہے اور جو چیز اس نے اٹھائی ہے وہ کھانے کی چیز نہیں ہے تو اسے پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح انسان جس مقصد کے لئے تگ و دو کرتا ہے درحقیقت اسی کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور جب اسے پتا چلتا ہے کہ اس سے چوک ہو گئی ہے اور وہ غلط راستے پر چلتا رہا ہے تو وہ اپنی غلطی اور فروگذاشت کی وجہ سے آزردہ ہوتا ہے اور ایک غلط مقصد کی خاطر تکلیف اٹھانے پر اسے افسوس ہوتا ہے۔ دراصل انسان ہر سہو اور خطا سے بچنا چاہتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو اپنا صحیح مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی فطرت اور جبلت کی رو سے حقیقت پسند واقع ہوا ہے۔ اور ہمیشہ ہر حالت میں حقیقت کو تلاش کرتا ہے اور سچائی کی پیروی کرتا ہے اور اس نے یہ فطری عادت کسی سے نہیں سیکھی۔ اگر کسی وقت انسان سرکشی کا اظہار کرتا ہے اور سچائی کو قبول نہیں کرتا تو یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ غلطی کھا جاتا ہے اور سچائی اور حقیقت اس پر واضح نہیں ہوتی اور اگر اسے سچائی اور حقیقت کا علم ہوتا تو وہ غلط راستے پر نہ چلتا۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ہوا و ہوس کے اثر کے تحت انسان ایک قسم کی روحانی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے سچائی کا میٹھا ذائقہ اسے کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت وہ سچائی کو پہچانتے ہوئے اس کی پیروی نہیں کرتا اور باوجودیکہ وہ سچائی کے درست ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے لیکن اس کی متابعت سے باز رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مضر اور نقصان دہ چیزوں کا عادی ہو کر وہ اپنی انسانی

جبلت کو (جو خطرے کو دور کرنے اور نقصان سے بچنے کی متقاضی ہے) پامال کرڈالتا ہے اور ایسے کام کرتا ہے جو اس کے لئے نقصان دہ ہوں۔ جیسے کہ لوگ الکحل، مشروبات اور مخدرات ہیروئن، بھنگ وغیرہ کے عادی ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید انسان کو حقیقت پسندی اور سچائی کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس بارے میں بے حد اصرار کرتا ہے اور مختلف بیانات کے ذریعے لوگوں کو ہدایت کرتا ہے کہ اپنی حقیقت پسندی اور سچائی کی پیروی کی جبلت کو زندہ رکھیں۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

"کیا سچائی کے بعد گمراہی کے علاوہ اور کوئی چیز ہو سکتی ہے؟"

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:۔

"ان لوگوں کے سوا جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے اور سچائی کی پیروی کرتے رہے اور ایک دوسرے کو سچائی پر قائم رہنے کی سفارش کرتے رہے باقی سب لوگ گھاٹے میں ہیں۔ (العصر ۲-۳)

ظاہر ہے کہ خدا نے یہ تمام تاکید اس لئے کی ہے کہ اگر انسان اپنی حقیقت پسندی کی جبلت کو زندہ نہ رکھے اور سچائی اور حقیقت کی پیروی کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوگا اور ہر ہوس آمیز اور دل کو لبھانے والے قول اور فعل کے پیچھے بھاگے گا اور غلط اور بیہودہ خیالات میں گرفتار ہو جائے گا اور یہی وہ وقت ہوگا جب وہ ایک بجو بلے کی طرح اپنے راستے سے (جو انسانی کا اصلی سرمایہ ہے) ہٹ جائے گا اور اپنی ہوا و ہوس، لاابالی پن اور نادانی کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔

ارشاد خداوندی ہے:۔

"تم ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو جو اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے ہیں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم ان کی اصلاح اور تربیت کر سکتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ ان میں سے بیشتر سنتے اور سمجھتے ہیں؟ نہیں۔ بلکہ یہ تو چارپایوں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ جب انسان کی حقیقت پسندی کی جبلت زندہ ہو جائے اور سچائی کی پیروی کرنے کی عادت اس کے اندر کام کرنے لگے تو حقیقتیں یکے بعد دیگرے اس کے سامنے آجاتی ہیں اور جس سچائی اور حقیقت کو وہ پالیتا ہے کشادہ بازوؤں کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے اور ہر روز سعادت اور خوش نصیبی کی جانب ایک نیا قدم اٹھاتا ہے۔ (سورۂ الفرقان آیت۔ ۴۴) (مکتب اسلام)

معرفت خدا از سورۂ فاتحہ

سورۂ فاتحہ جس سے قرآن کریم کا افتتاح اور آغاز ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا درس پیش کرنے کے لحاظ

سے ایک بہترین باب عرفان ہے۔ جو طالبانِ معرفت کو نہ ہی ویدوں کی ابتداء کی طرح عناصر کی مہما کے گیت سُنا کر مشرکانہ وساوس میں مبتلا کرتی ہے۔ اور نہ ہی تورات کے شروع باب کی طرح اندھیرے اور اُجالے کی حکایت سُنا کر ایک افسانہ گو کی حیثیت میں پیش ہوتی ہے۔ اور نہ ہی انجیل کی طرح خداوند کا نسب نامہ بیان کرنے کے لئے شجرہ نسب کامسلسل جو خدا کے لئے آباؤ اجداد کے ذکر پر مشتمل ہے لمبے بیان کرتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے شروع میں ہی خدا تعالیٰ کی بے نظیر معرفت کا عجیب الحقائق الفاظ میں سبق دیتی ہے اور ان کے لئے الٰہی عرفان کا ایسے طور پر کامل انکشاف پیش کرتی ہے کہ جس سے زائد متصور نہیں۔

چنانچہ وہ ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

سورۂ فاتحہ کو اُم الکتاب کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے۔ کہ جو کچھ قرآن کریم میں اسلامی تعلیم کو تفصیلات اور توضیحات کے طور پر بیان کیا گیا ہے وہ سب کچھ اصل الاصول کے طور پر سورۂ فاتحہ میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر خدا تعالیٰ کی وہ سب صفات جو قرآن کریم میں پیش کی گئیں۔ ان سب کے لئے سورۂ فاتحہ میں پیش کردہ صفات کو ام الصفات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

عالمِ کائنات جو خدا تعالیٰ کا صحیفہ قانونِ قدرت ہے یہ خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب ہے جس کے مقابل قرآن کریم خدا تعالیٰ کی قولی کتاب پائی جاتی ہے۔ اور قرآن کریم کے مفصل صحیفہ کے مقابل سورۂ فاتحہ اُم الکتاب ہے جو اگرچہ اپنی اجمالی صورت میں بالکل مختصر اور چھوٹی سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تفصیل کے لحاظ سے قرآن کریم کو سورۂ فاتحہ ہی کی تفسیر کہنا چاہئے اسی طرح عالمِ موجودات جو خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب اور مفصل ہونے سے عالم کبیر کہلاتا ہے۔ اس کے بالمقابل فعلی کتاب کی سورۂ فاتحہ یا ام الکتاب حضرت انسان ہے۔ جو عالمِ کبیر کے مقابل عالم صغیر بھی کہلاتا ہے اور دانہ کی طرح جو کچھ اس میں مجمل حیثیت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ تفصیلی طور پر وہ سب کچھ درخت کی طرح عالمِ موجودات میں رونما ہے۔ پس اس صورت میں کہ انسان خدا کی فعلی کتاب کی جو عالم کبیر ہے سورۂ فاتحہ یا اُمّ الکتاب ہے جیسے قرآن کریم جو خدا کی قولی کتاب ہے اس کے لئے سورۂ الحمد سورۂ فاتحہ ہے۔ انسان کو ہاں کامل انسان کو سورۂ فاتحہ سے ایک کامل مشابہت حاصل ہے اور اسی وجہ سے لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ارشاد کے ماتحت انسان کی فطرت سلیمہ اور متطہرہ میں یہ استعداد رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی قوت ادراک کی لطیف جس کے ذریعہ ایک طرف صفات الٰہیہ کے حقائق کا علم حاصل کرے اور دوسری طرف اپنی باریک بینی سے موجوداتِ عالم کے عجائبات پر اطلاع پائے چنانچہ یہ ملکہ اور استعداد جو انسان کو عطا ہوا ہے وہ کسی اور ہستی کو عطا نہیں کی گئی اسی وجہ سے انسان کو ایک طرف خالق سے گہرا تعلق ہے۔ اور دوسری طرف مخلوق سے یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ابتدائی کلمات میں ایک طرف صفات الٰہیہ کا ذکر پیش کیا ہے

تو دوسری طرف انہی صفات کی تجلیات کا مظہر العالمین کو پیش کیا ہے۔ کیونکہ العلمین جو انواع اقسام کی مخلوق ہے وہ صفات الٰہیہ کی تجلی گاہ اور افعال الٰہیہ کے اثر کے لئے ظہور گاہ ہے۔

اسی لئے انسان کو خدا کا عارف بنانے کے لئے پہلے العلمین کے منظر کی طرف توجہ دلا کر اسے متنبہ کیا گیا ہے۔ کہ العلمین کا منظر جس قدر بھی محامد اور محاسن کا حامل نظر آتا ہے۔ ان محامد اور محاسن کا حقیقی معنوں کے لحاظ سے عالمین کا وجود مستحق نہیں اس لئے کہ عالمین کا وجود اللہ تعالےٰ کی حمید مجید ہستی کی صفتِ رب اور صفتِ رحمان اور صفتِ رحیم اور صفتِ مالک یوم الدین کا مظہر ہونے سے اللہ تعالےٰ کی محامد اور محاسن کے دکھانے کے لئے بطور آئینہ کے ہے۔ پس اس لحاظ سے کہ العالمین کا وجود صفت رب کے فیض کا اثر ہے۔ جس کے ظہور کے لئے صفتِ رحمان صفت رحیم اور مالکِ یوم الدین کا فیض بھی بطور تعاون محرک اور کارفرما ہوا۔ اسلئے جو کچھ بھی العالمین کی خلقت میں محامد اور محاسن پائے جاتے ہیں۔ وہ اس کے خالق کے محامد اور محاسن ہیں اس لئے کہ مخلوق کے پاس جو کچھ بھی ذات صفات کا وجود ہے وہ سب خالق کا دیا ہے۔ اور لفظ رَبّ قرآن کریم کی آیت یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ کے رو سے خالق کے معنوں میں بھی ہے۔ اور آیت رَبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيۡ صَغِيۡرًا کے رو سے ادنےٰ حالت سے ترقی دینے کے ساتھ ترقی کے انتہائی درجہ کے بلند تر مقام تک پہنچانے والے کے معنوں میں بھی پس فقرہ الحمد للّٰہ میں جو دعویٰ ہے۔ بعد کی صفات میں اس دعویٰ کا ثبوت پیش کیا ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ ہر ایک حمد جو العالمین کے وجود میں پائی جاتی ہے۔ یہ سب حمد اور ہر طرح کی حمد اپنی حقیقت کے رو سے اللہ تعالےٰ ہی کے لئے ہے اس لئے کہ اللہ تعالےٰ عالمین کا رب ہے۔ اور رب ہونے سے عالمین کا خالق ہے۔ جس کے فیض خالقیت سے پہلے وہ معدوم اور نیست محض تھا۔ اور نیست سے ہست اور عدم سے وجود میں لانے کے لئے اس نے محض رحمانیت کے فیض سے بلا کسی استحقاق کے اور بلا کسی معاوضہ کے فیضیاب کیا اور صفت رحیمیت سے اس کے وجود کے لئے ترقی کی راہیں کھولیں اور صفت مالک یوم الدین سے اس کے وجود کے لئے اسے ایک قوت مؤثر عطا فرمائی جس سے وہ متصرف فی الامور ہوا۔ اب عالمین کے منظر پر نگاہ ڈالنے سے عالمین کا وجود کیا ثابت ہوا۔ اللہ تعالےٰ کی محامد کا مظہر اور آئینہ خدا نما۔ جب عارف انسان عالمین کے صحیفہ پر نظرِ تفکر ڈالنے سے درسِ معرفت کا فائدہ حاصل کرتا ہوا۔ خدا تعالیٰ کی صفات کو یکے بعد دیگرے مطالعہ میں لاتا ہے۔ تو بار بار کے مطالعہ سے اس کی عارفانہ حس ذوقِ معرفت اور لذتِ عشق میں ترقی کرتی ہوئی اس مرتبہ پر جا پہنچتی ہے کہ جس طرح پہلے العالمین کا وجود اس کے سامنے ظاہر تھا۔ لیکن رب۔ رحمان۔ رحیم اور مالک یوم الدین کی صفات سے متصف خدا اس کی نظر سے مخفی اور پوشیدہ اب اس کے برعکس عرفان کی ترقی کے ساتھ

عالمین کا وجود اس کی نظر سے مخفی ہو جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ اپنی صفات متذکرہ کی تجلیات کے ساتھ جلوہ نما ہوتے ظاہر۔ ایسی حالت میں عارف الحمد للہ کے بے پردہ اور پُر حسن منظر سے بے حد متاثرانہ کیفیت کے ساتھ ذیل کے کلام سے عاشقانہ بے تابی کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

کس قدر ظاہر ہے نور اس مبداء الانوار کا
بن رہا ہے سارا عالم آئینہ ابصار کا

اور یہی وہ مقام اور درجۂ عرفان ہے جہاں عارف اور صاحب سلوک انسان عالمین کے پُر ظلمت حجابوں سے نکل کر ترقی کرتے ہوئے اس مرتبۂ معرفت پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اس کی شنید دید سے بدل جاتی ہے۔ اور اس کا ایمان عرفان سے اور اس کا غیب مشاہدہ سے اور اس مقام شہود دیۃ پہنچنے سے وہ اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ الحمد للہ سے مالک یوم الدین تک کا جو کلام اس نے غائب کے صیغوں کے رنگ میں پڑھا اب اس عارفانہ بصیرت کے حصول کے بعد وہ بجائے ایاہ نعبد و ایاہ نستعین کے فقرہ کے جو پہلے کلام کے سلسلہ میں مجوبانہ نگاہ میں موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کے مخاطب اور حاضر کے صیغہ سے پڑھیئے۔ اس لئے کہ چاروں صفات کے مطالعہ کا اثر قلب عارف پر محسوس ہونے سے عالمین کی بجائے رب العالمین کو حالت مشاہدہ میں لے آتا ہے۔ اور مشاہدہ کی حالت اس امر کی مقتضی ہے کہ غائب کے صیغہ کی جگہ خدا تعالیٰ کو صیغہ مخاطب اور ضمیر خطاب سے ذکر کیا جائے۔ چنانچہ اس حکمت بالغہ کی بنا پر صنعتِ التفات سے کام لیا گیا۔ یہ وہ شہودی مقام ہے۔ جہاں خدا تعالیٰ کی صفات کا جلوہ آنکھوں کے سامنے پھرنے سے اور العالمین کا وجود مخفی ہو جانے سے خدا اور صرف خدا ہی کے لئے عارف الشان اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اے ان صفات والے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں اور طلب کرتے رہیں گے۔ لیکن صفاتِ اربعہ پر نظر ڈالنے سے جو معرفت ہوتی ہے۔ یہ عقلی معرفت ہے جس کے نتیجہ میں انسان اپنے اندر یہ بات محسوس کرنے لگتا ہے کہ عبادت اور بندگی اور پرستش ایسے ہی خدا کے لئے ہے اس کے سوا کسی اور کی پرستش کرنا غلطی اور سخت غلطی ہے۔ اور عقلی معرفت اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے صرف ضرورت محسوس کراتی ہے۔ اور اسبات کے لئے مجبور کرتی ہے۔ کہ انسان عبادت کے لئے خدا ہی کی طرف متوجہ ہو۔ یہ عقلی معرفت سورۂ فاتحہ کے ابتدائی حصہ سے حاصل ہوتی ہے اس کے ذریعے سے بھی توحید الٰہی کی پُر عظمت اور پُر جلالت شان اللہ تعالیٰ کی بے نظیر ذات کے لئے مختص نظر آتی ہے۔ اور اس عقلی معرفت کے سوا ایک دوسری قسم کی معرفت ہے۔ جو ایمان لانے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور اس مومنانہ معرفت کے حصول کا ذریعہ سورۂ فاتحہ کا آخری حصہ ہے۔ یعنی اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ

عَلَیۡہِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ۝ سورہ فاتحہ کے اس آخری حصہ میں جو بطور دعا ہے انسان کو دُعا کرنا سکھلایا ہے۔ کہ وہ خدا سے صراط مستقیم طلب کرے۔ صراط مستقیم کے لئے دُعا کرنے سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی مسافرانہ اور سالکانہ ہے۔ کیونکہ راستہ کی اور پھر سیدھی راہ کی ضرورت اسے ہی پیش آتی ہے۔ جو سفر اختیار کرنے والا ہو۔ اور انسان کا سفر دنیا میں تین طرح کا ہے۔ ایک مکانی ایک زمانی اور ایک روحانی۔ مکانی اور زمانی سفر تو ظاہر ہی ہے کہ انسان مکانی حیثیت کے لحاظ سے نقل و حرکت کرتا رہتا ہے۔ ایسا ہی زمانہ کے لحاظ سے ایک سیکنڈ سے دوسرے سیکنڈ میں اور ایک منٹ سے دوسرے منٹ میں اور ایک گھنٹہ سے دوسرے گھنٹہ میں اور ایک دن سے دوسرے دن میں اور ایک ہفتہ اور ماہ سال سے نکل کر دوسرے ہفتہ اور ماہ اور سال میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن روحانی سفر کی نقل و حرکت یہ ہے کہ انسان عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کے ساتھ کوشش کرنے سے اس مسافت کو جو بعد کے طور پر خدا اور بندہ کے درمیان روحانی طور پر پائی جاتی ہے اسے طے کر کے خدا تک پہنچ جائے۔ اور اس کا کوئی دم اور کوئی قدم کسی مکانی یا زمانی نقل و حرکت کے لحاظ سے ایسا نہ ہو۔ جو روحانی سفر کے لحاظ سے صراط مستقیم اور عقائد صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کسی حد اور دائرہ سے باہر ہو۔

صراط مستقیم کیا چیز ہے یہی کہ عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کے ساتھ اپنی زندگی کو خدا تعالےٰ کی عبادت اور اطاعت میں لگا دینا۔ دوسرے لفظوں میں تَخَلَّقُوۡا بِاَخۡلَاقِ اللّٰہِ اور صِبۡغَۃَ اللّٰہِ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبۡغَۃً کے ارشاد کے ماتحت صفات اربعہ جو سورہ فاتحہ کے شروع میں پیش کی گئیں۔ ان کو مظہریت کے طور پر اپنے اندر جاری کرنا اور ان کے رنگ سے اپنے تئیں رنگین کرنا۔ یہی وہ بات ہے۔ جس کے حصول سے انسان منعمین کی جماعت میں جو انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی جماعت ہے۔ داخل ہو جاتا ہے اور توحید کا حقیقی اقرار اور کاملانہ اقرار یہی ہے کہ انسان خدا تعالےٰ کی صفات کو اپنے اندر جاری کرنے سے ان صفات کا مظہر بن جائے اور خدا تعالےٰ کی توحید کے لئے شہادت دینے کے واسطے ظلّی طور پر اس مقام پر کھڑا کیا جائے۔ جس مقام پر پہنچنے سے انسان خود آئینہ توحید ہو جائے۔

پس خدا تعالےٰ کی ایسی معرفت جو صفات الٰہیہ کی مظہریت کی شان اور علاوہ کے اندر صفات جلیلہ ہونے کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ یہ معرفت کا درجہ سب درجوں سے بالاتر اور حقیقی ایمان کا ایک بے نظیر ثمرہ ہے۔ اور ایسا انسان جسے یہ درجہ حاصل ہوتا ہے۔ نہ وہ صرف قال اور عقلی باتوں سے ہی توحید کی شہادت پیش کرتا ہے بلکہ وہ خدا تعالےٰ کے بابرکت تعلقات کے بابرکت نتائج سے جو قبولیتِ دُعا اور خدا تعالےٰ کے مکالمات و مخاطبات اور کثرت امور غیبیہ سے مزین بشارات کی صورت میں اسے حاصل ہوتے ہیں۔ دُنیا میں ایک پُر شوکت اعلان اور پُر عظمت

منادی کے ساتھ خدا تعالےٰ کی توحید کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسان پہنچ کر آنحضرتؐ کی ظلیت میں خدا تعالےٰ کی وحدت کے دریا میں مستغرق ہو کر توحید کا ان الفاظ میں اظہار کرتا ہے کہ لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ نبی مرسل ولا ملک مقرب۔ یعنی بارگاہ قدس کی اس حضوری کے وقت کسی نبی مرسل اور ملک مقرب کی بھی وسعت اور گنجائش نہیں ہو سکتی۔ (۲۸)

معرفتِ الٰہیہ کے لئے ملّتِ جعفریہ کی تحقیقی پیشکش

فلسفۂ توحید

۱۴- جلدیں

تالیف: مولانا طالب حُسین کرپالوی

جعفریہ دار التبلیغ: امام بارگاہ سانده کلاں، لاہور

خصوصی معاونین

(سنہ ۱۹۹۰ء)

ادارہ مندرجہ ذیل مومنین کرام کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے خصوصی تعاون فرما کر ہماری تالیفات کو زیورِ طباعت سے آراستہ فرمایا۔ خدا ان سب کو جمیع مقاصد حسنہ میں کامیاب و کامران فرمائے۔ آمین۔

(۱) جناب معراج دین صاحب، لاہور — دس ہزار روپے

(۲) جناب مرزا حسین علی صاحب — تین ہزار روپے

ایک ہزار روپے

عطا فرمانے والے

(۱) جناب علی رضائی لاکھانی صاحب کراچی

(۲) جناب ڈاکٹر سید اجمل حسین رضوی صاحب، راولپنڈی

(۳) جناب سید محمد اکرم کاظمی صاحب، لاہور

(۴) جناب سید حسن محمود صاحب، لاہور

(۵) جناب سید حسن علی زیدی صاحب، لاہور

(۶) جناب چوہدری مشتاق حسین صاحب لاہور

(۷) جناب سید عون محمد زیدی صاحب پشاور

(۸) جناب کرنل سید علی طاہر بخاری صاحب، لاہور

(۹) جناب خواجہ مجتبیٰ حسین صاحب، لاہور

(۱۰) جناب ڈاکٹر سید شمیم عباس صاحب زیدی، لاہور

(۱۱) جناب مولانا سید صادق علی نجفی صاحب، دوبئی

(۱۲) جناب معراج دین صاحب، لاہور

(۱۳) جناب سید فاخر حسین رضوی صاحب سیالکوٹ

(۱۴) جناب سید جواد حیدر صاحب، لاہور

(۱۵) جناب سید اسد بخاری صاحب، لاہور

(۱۶) جناب سید برکت علی شاہ صاحب، فیصل آباد

(۱۷) جناب سید تنظیم حسین نقوی صاحب، لاہور

(۱۸) جناب سید عابد زیدی صاحب، کراچی

(۱۹) جناب آغا سید ین صاحب، لاہور

(۲۰) جناب سید نفیس عباس زیدی صاحب لاہور

(۲۱) جناب سید مجید حسین نقوی صاحب، لاہور

وعدے

(۱) جناب سید حسن علی زیدی صاحب، لاہور — بیس ہزار روپے
(۲) جناب شکیل رضا سید صاحب، فیصل آباد — دس ہزار روپے
(۳) جناب ملک الطاف حسین صاحب، لاہور — دس ہزار روپے

ایک ایک ہزار روپے
دینے کے وعدے

(۱) جناب اعجاز حسین صاحب، لاہور
(۲) جناب سید ظفر حسنین زیدی صاحب، لاہور
(۳) جناب ظفر سیال صاحب، جھنگ
(۴) جناب سید وصی حیدر زیدی صاحب، لاہور
(۵) جناب سجاد حسین صاحب، شرقپور
(۶) جناب سید حر ریاحی گردیزی صاحب، ملتان
(۷) جناب سید سجاد امام زیدی صاحب کراچی
(۸) جناب سید صادق حیدر کرمانی صاحب، شیر گڑھ
(۹) جناب کرنل سید اظہر نقوی صاحب، منگلا
(۱۰) جناب خواجہ سلطان محمود صاحب، لاہور
(۱۱) جناب شیخ امانت علی صاحب، لاہور
(۱۲) جناب سید فضل عباس ہمدانی صاحب، راولپنڈی
(۱۳) جناب سید انیس عباس زیدی صاحب، لاہور
(۱۴) جناب سید اختر عباس زیدی صاحب، لاہور
(۱۵) جناب ممتاز حیدر مالکی صاحب، لاہور

اخراجات سنہ ۱۹۹۰-۹۱ء

اخراجات فی جلد — پچیس ہزار روپے صرف
سالانہ — چھ جلدیں
کل اخراجات سالانہ — ڈیڑھ لاکھ روپے

فہرست

باب اوّل

ایمان باللہ

باب دوم

معرفت خدا

باب سوم

عقیدۂ توحید

مصادر

(۱)	اثبات واجب الوجود	مفتی محمد انوار الحق	مطبع مفید عام آگرہ
(۲)	احسن الفوائد	ڈھکو، محمد حسین	سرگودھا
(۳)	احقاق حق	مراد آبادی، سید محمد نعیم الدین	نعیمیہ رضویہ، لاہور
(۴)	ادیان عالم اور فرقہ ہائے اسلام کا تقابلی مطالعہ	نقوی، سید علی حیدر	کراچی
(۵)	الارشد الامین	(الارشد الامین) غزالی	معین الادب، لاہور
(۶)	اساسیات اسلام	ندوی، محمد حنیف	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور
(۷)	اسلام اور سائنس	قادری، منظور محمد	اسلامی مشن لاہور
(۸)	اسرار حق	برنی، محمد الیاس	مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ
(۹)	اسلام کا عام فہم تعارف	طنطاوی، شیخ علی	البدر، لاہور
(۱۰)	اسلامی نظریہ حیات	خورشید احمد	شعبہ تصنیف کراچی یونیورسٹی
(۱۱)	اصول دین	زیدی، بوعلی	حق برادرز، لاہور
(۱۲)	الحاد مغرب اور ہم	برق، ڈاکٹر غلام جیلانی	علماء اکیڈمی، لاہور
(۱۳)	اللہ	العقاد، عباس محمود	معین الادب، لاہور
(۱۴)	انسان اور خدا	مکری، عتیق	ادارہ علمیہ، ملتان
(۱۵)	انسان اور اس کی تقدیر	ڈسکوی، فیروز	انوار الاسلام، سیالکوٹ ۱۳۲۸ھ
(۱۶)	اہم مسائل	مخدوم ملک رضا حسین	گورداسپور ۱۹۴۲ء
(۱۷)	ایمان اور اخلاق	صدیقی، عبد الحمید	البدر پبلی کیشنز لاہور
(۱۸)	ان دیکھی حقیقتیں	کوثر نیازی	آئینہ ادب لاہور
(۱۹)	ایک اعلیٰ ہستی	مرزا سلطان احمد	قادیان انڈیا
(۲۰)	آیات الٰہیہ	لکھنوی محمد حسین	ملتان
(۲۱)	براہین عزیزیہ	عبد العزیز	انڈیا
(۲۲)	پیغام توحید	سرسوی، محمد سبطین	امامیہ کتب خانہ، لاہور

(٢٣) تاریخ فلسفۂ یونان	نعیم احمد	علمی کتب خانہ، لاہور
(٢٤) تخلیق کائنات و قرآن مجید	میاں محمد اسماعیل	لاہور
(٢٥) تنشریحہ الالٰہیہ	حکیم عبدالقادر	بیت الحکمۃ، لاہور
(٢٦) تفہیمات	مودودی، سید ابوالاعلیٰ	لاہور
(٢٧) توحید آئمہ	سید محمد ہارون	دارالاشاعت کراچی
(٢٨) توحید باری تعالیٰ	راجیکی، غلام رسول	قادیان
(٢٩) توحید اور عدل	جوہر، محمد مصطفیٰ	مجلس المسلمین، کراچی
(٣٠) توحید القرآن	زنگی پوری، سید محمد ہارون	ناظم الہند، لاہور
(٣١) توحید اسلام	گوپالپوری، سید نذر حسین	معارف آل محمد سیالکوٹ
(٣٢) ثبوت ذاتِ باری تعالیٰ	محمد ولی الدین	لاہور ١٩٢٦ء
(٣٣) جمال الٰہی	سہروردی، ابوالفیض قلندر علی	مجلس سہروردیہ لاہور
(٣٤) چشمۂ توحید	راجیکی، غلام رسول	ربوہ ١٩٧٣ء
(٣٥) حقوق والفرائض	ڈپٹی نذیر احمد	
(٣٦) خدا ایک کیوں؟	وارثی محمد عنایت اللہ	پروگریسو بکس لاہور ١٩٨٥ء
(٣٧) خدا کہاں ہے؟	منشی عبدالرحمان خاں	اشاعت علوم اسلامیہ ملتان
(٣٨) خدا کی ہستی	آزاد، ابوالکلام	مکتبہ قرآنیات، لاہور
(٣٩) خدا کا وجود اور توحید	جوہر، محمد مصطفیٰ	پیر ابراہیم ٹرسٹ، کراچی
(٤٠) خدا موجود ہے	جان کلوور مونز ما	مقبول اکیڈمی، لاہور
(٤١) خدا ہمارے ساتھ ہے	کریسی ماریسن۔ اے	شیخ غلام علی، لاہور
(٤١/١) الدر الفرید	سہا، سید امیر حسن	امریکن بک کمپنی راولپنڈی
(٤٢) دین و اسلام	آل کاشف الغطاء، شیخ محمد	مکتبہ امامیہ لاہور
(٤٣) دین و شریعت	نعمانی، محمد منظور	الفرقان، لکھنؤ
(٤٤) الدین والکون	سید کرامت حسین جسٹس	لکھنؤ
(٤٥) الدین القیم	گیلانی، سید مناظر احسن	نفیس اکیڈمی، کراچی
(٤٦) دینی رسائل	س۔ الف۔ ب	معارف اسلامیہ، کراچی

۴۷	دہریت سے اسلام تک	سید مفتی مختار الدین	مکتبہ مدینہ، لاہور
۴۸	ردّ نیچریت	افغانی، سید جمال الدین	مکتبہ شعر و ادب۔ لاہور
۴۹	راہ راست	فاروقی، ممتاز احمد	دار الکتب الاسلامیہ لاہور ۱۹۶۴ء
۵۰	سائنس اور اسلام	تھانوی، اشرف علی	ادارہ اشرفیہ، لاہور
۵۱	سائنس اور اسلام	قاری محمد طیب	ادارہ عثمانیہ، لاہور
۵۲	شعور خمسہ	امرتسری، حکیم رحمت اللہ	حجازی دواخانہ، لاہور
۵۳	عقائد و اعمال	صدیقی، محمد مظہر الدین	ثقافت اسلامیہ، لاہور
۵۴	عقلیات ابن تیمیہ	ندوی، محمد حنیف	ثقافت اسلامیہ، لاہور
۵۵	علم الکلام	کاندھلوی، محمد ادریس	مکتبہ عثمانیہ، لاہور
۵۶	علم الکلام اور کلام	نعمانی، شبلی	مسعود پبلشنگ، لاہور
۵۷	عین الیقین	ناطق، سید احمد حسین	لکھنؤ
۵۸	فلسفۂ اسلام	سلطان مرزا	امامیہ کتب خانہ، لاہور
۵۹	فلسفہ قرآن و تصوف	نواب سر محمد یامین صاحب	دین محمدی لاہور
۶۰	فلسفۂ مذہب	ایڈون۔ اے برٹ	مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء
۶۱	قدامت روح و مادہ اور تناسخ	منشی برکت علی	لاہور ۱۹۱۱ء
۶۲	قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں	مودودی، ابو الاعلیٰ	رامپور
۶۳	قرآن آپ سے کیا چاہتا ہے	نعمانی، محمد منظور	الفرقان لکھنؤ ۱۹۶۰ء
۶۴	قرآنی تعلیمات کا نقطۂ ماسکہ	فاروقی عبد الحمید	اسلامک ریسرچ مشن جھنگ
۶۵	قرآنی سائنس	شرقپوری، منشی فضل کریم	شرقپور
۶۶	قول سدید	خواجہ غلام السیدین	لکھنؤ
۶۷	کائنات کی گواہی	بجنوری، اظہر جلیل	تحقیقات تعلیمات اسلامیہ، لاہور
۶۸	مبدأ آفرینش	ڈاکٹر محمد صادق	سازمان توحید کراچی
۶۹	مذہب اور سائنس کی رزم بزم	ذکاء اللہ	مطبع احمدی دہلی
۷۰	مذہب اور سائنس	ندوی عبد الباری	مکتبہ رشیدیہ، لاہور
۷۱	مذاہب عالم اور اسلام	النور، عبد الحی پروفیسر	لاہور

۷۱/۱	معرفت الٰہیہ		لاہور
۷۲/۲	مسلم فلسفہ	ڈاکٹر عبد الخالق، پروفیسر یوسف شیدائی	عزیز پبلشرز، لاہور
۷۳	مظاہرہ قرآن	سید مقبول احمد	الٰہ آباد
۷۴	مقالات ایوبی	محمد ایوب	مکتبہ رازی، کراچی
۷۵	مقیاس حنفیت	اچھروی، محمد عمر	دار المقیاس، لاہور ۱۹۶۶ء
۷۶	ملحدین کے شبہات	سید حامد علی	ادارہ شہادت حق بریلی
۷۷	میری آخری کتاب	برق، غلام جیلانی	مکتبہ شاہکار لاہور
۷۸	من ویزدان	پرویز، غلام احمد	طلوع اسلام لاہور
۷۹	وجود باری تعالیٰ اور توحید	ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ	مکتبہ قرآنیات، لاہور
۸۰	ہستی باری تعالیٰ	مرزا بشیر الدین محمود	شرکت اسلامیہ، ربوہ
۸۱	ہمارا خدا	مرزا بشیر احمد	شرکت اسلامیہ، ربوہ
۸۲	ہمارا خالق	محمد ضیاء اللہ	جاوید احمد، لاہور ۱۹۷۳ء